QUARTERLY, PEER REVIEWED
al-amiR
ISSN(P): 2790-931X ISSN(E): 2790-9328
E-Mail: editor.alamir@gmail.com

الوہیت مسیحؑ کے مسیحی مقدمات اور قرآنی عقلی جواب: ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کے تناظر میں تحقیقی جائزہ

The Christian Premises for the Divinity of Christ and the Qur'anic Rational Response: An Analytical Study in Light of al-Mā'idah 5:75

Dr. Hafiz Fayaz Ali
Lecturer, Department of Islamiyat, University of Peshawar.
Email: hafizfayazisl@uop.edu.pk
Jeena Javeria
MS Scholar, Department of Islamiyat, University of Peshawar.
Email: jeenajaveria25@uop.edu.pk

Abstract
Few verses in the Qur'an compress so decisive an argument into so few words as Surah al-Mā'idah 5:75, where the claim that Jesus is God is answered with a single, almost domestic observation: he and his mother "both used to eat food." This article contends that the observation is not a rhetorical aside but the minor premise of a rigorous syllogism whose major premise is the one attribute no coherent theism can surrender: divine self-sufficiency (ghinā, aseity). Drawing on the Qur'an, classical exegesis, kalām, and contemporary analytic philosophy of religion, the study first establishes twelve necessary conditions of divinity, namely necessary existence, eternity, absolute self-sufficiency, omnipotence, omniscience, self-subsisting life, unicity, transcendence of body and change, creatorship, sovereignty over benefit and harm, freedom from begetting, and the answering of prayer, each grounded in revelation and reason. It then reconstructs the principal Christian arguments for the divinity of Christ: the virgin birth, the miracles, the titles "Son of God" and "Logos", the Johannine claims of unity with the Father, and the soteriological necessity of a divine redeemer. The central argument is that eating entails dependence, composition, change and mortality, each of which contradicts attributes that Christianity itself ascribes to God (Psalm 50:12, Malachi 3:6). The Chalcedonian appeal to two natures does not escape the argument, it falls into a dilemma. If the one divine Person is the true subject of eating, as the doctrine of the communication idiomatum requires, divine aseity is forfeited. If the human nature eats as a subject of its own, the result is the very Nestorianism the Church condemned at Ephesus in 431. The verse therefore turns Christianity's own metaphysics against the doctrine of the Incarnation, while its tone, which honours Mary as ṣiddīqah even in the act of refutation, models a form of interreligious dialogue that refutes without demeaning.

Keywords: *Divinity of Christ, Divine Aseity, al-Mā'idah 5:75, Chalcedonian Christology, Communication Idiomatum, Qur'anic Argumentation, Kalām.*

تمہیدی گفتگو:

انسانی فکر کی پوری تاریخ میں شاید ہی کوئی سوال اتنا بنیادی، اتنا نازک اور اتنا دور رس رہا ہو جتنا یہ سوال کہ "خدا کون ہے، اور کون خدا نہیں ہو سکتا؟" یہ سوال محض علم کلام کی کسی کتاب کا ایک باب نہیں بلکہ انسان کی پوری عملی زندگی کا محور ہے کیونکہ جس ہستی کو انسان معبود مان لیتا ہے، اسی کے آگے وہ جھکتا ہے، اسی سے امید باندھتا ہے اور اسی کے تصور سے اپنی اخلاقیات، اپنی تہذیب اور

اپنے انجام کا نقشہ کھینچتا ہے۔ اسی لیے قرآن مجید نے توحید کو محض ایک عقیدے کے طور پر پیش نہیں کیا بلکہ اسے دلیل، مشاہدے اور فطرت کی گواہی کے ساتھ ایک مکمل فکری مقدمے کی صورت میں انسان کے سامنے رکھا ہے۔

مسیحیت کی تاریخ میں یہ سوال ایک منفرد اور پیچیدہ شکل میں سامنے آیا۔ سوال یہ تھا کہ وہ ہستی جو ناصرہ کی گلیوں میں چلتی پھرتا رہا، جس نے بھوک محسوس کی، جو سفر سے تھک کر کنویں کے کنارے بیٹھ گیا، جو کشتی میں سو گیا، جس نے آخری گھڑی کے علم سے لاعلمی ظاہر کیا اور جسے بالآخر صلیب پر لٹکایا گیا (جیسا کہ مسیحی عقیدہ ہے) کیا وہی ہستی بیک وقت ازلی، ابدی، قادر مطلق اور ہر احتیاج سے پاک خدا بھی تھی؟ مسیحی کلیسا نے چوتھی اور پانچویں صدی عیسوی کی مجالس میں اس سوال کا جواب "ہاں" میں دیا اور پھر اس جواب کو منطقی طور پر قابل قبول بنانے کے لیے صدیوں تک الٰہیاتی تعبیرات کی ایک وسیع عمارت تعمیر کی۔

قرآن مجید نے اس پوری عمارت کا جواب کسی طویل فلسفیانہ بحث سے نہیں دیا بلکہ ایک ایسے مختصر جملے سے دیا جو بظاہر ایک معمولی گھریلو مشاہدہ معلوم ہوتا ہے: ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾، یعنی "وہ دونوں (مسیحؑ اور ان کی والدہ) کھانا کھایا کرتے تھے"[1]۔ پہلی نظر میں یہ جملہ اتنا سادہ ہے کہ قاری اسے ایک ضمنی بات سمجھ کر آگے بڑھ جاتا ہے لیکن جب اسے الٰہیات کے بنیادی اصولوں کی روشنی میں دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس ایک جملے میں ایک مکمل منطقی برہان پوشیدہ ہے جس کا ہر مقدمہ عقل کے نزدیک مسلّم ہے اور جس کا نتیجہ ناقابل تردید۔ یہی اس آرٹیکل کا بنیادی دعویٰ ہے۔ قرآن مجید سورۃ المائدۃ میں مسیحیوں کی اسی عقیدے کا تذکرہ اور ردّ دونوں ذکر کرتا ہے۔ ارشاد باری تعالیٰ ہے

> "لَقَدْ كَفَرَ الَّذِيْنَ قَالُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْمَسِيْحُ ابْنُ مَرْيَمَ ۭ قُلْ فَمَنْ يَّمْلِكُ مِنَ اللّٰهِ شَيْـــًٔا اِنْ اَرَادَ اَنْ يُّهْلِكَ الْمَسِيْحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَاُمَّهٗ وَمَنْ فِي الْاَرْضِ جَمِيْعًا ۭ وَلِلّٰهِ مُلْكُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ وَمَا بَيْنَهُمَا ۭ يَخْلُقُ مَا يَشَاۗءُ ۭ وَاللّٰهُ عَلٰي كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ"
>
> ترجمہ: "جن لوگوں نے یہ کہا ہے کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے وہ یقیناً کافر ہو گئے ہیں۔ (اے نبی! ان سے) کہہ دو کہ اگر اللہ مسیح ابن مریم کو اور ان کی ماں کو اور زمین میں جتنے لوگ ہیں ان سب کو ہلاک کرنا چاہے تو کون ہے جو اللہ کے مقابلے میں کچھ کرنے کی ذرا بھی طاقت رکھتا ہو؟ تمام آسمانوں اور زمین پر اور ان کے درمیان جو کچھ موجود ہے اس پر تنہا ملکیت اللہ ہی کی ہے۔ وہ جو چیز چاہتا ہے پیدا کرتا ہے۔ اور اللہ ہر چیز پر پوری پوری قدرت رکھتا ہے"[2]

مسیحیوں کے اس عقیدے کو "الوہیت مسیح" یا "عقیدہ عینیت مسیح" کہتے ہیں۔ جس کا ایک طرف ذکر کیا تو دوسری طرف یہ بتایا کہ "الٰہ" بننے یا ہونے کیلئے کن شرائط کا پایا جانا ضروری ہے؟

اکیسویں صدی میں بین المذاہب مکالمہ محض علمی مجالس تک محدود نہیں رہا۔ ڈیجیٹل ذرائع ابلاغ نے مذہبی مباحث کو ہر گھر تک پہنچا دیا ہے، اور ایک عام مسلمان نوجوان آج ایسے مسیحی مناظرانہ دلائل سے روبرو ہوتا ہے جن کا سامنا ماضی میں صرف متخصص علماء کو ہوتا تھا۔ ان دلائل میں کنواری ولادت، معجزات، "ابن اللہ" کا لقب اور یوحنا کی انجیل کے بعض جملے بار بار پیش کیے جاتے ہیں۔ اس صورت حال میں ضرورت اس بات کی ہے کہ قرآن کے استدلال کو اس کی پوری عقلی گہرائی کے ساتھ پیش کیا جائے تاکہ واضح ہو سکے کہ قرآن کا موقف محض ایک عقیدتی دعویٰ نہیں بلکہ ایک مضبوط فلسفیانہ بنیاد پر قائم ہے۔ اسی طرح یہ بھی ضروری

ہے کہ یہ مکالمہ تحقیر یا تمسخر کے بجائے اس ادب کے ساتھ ہو جس کا نمونہ خود یہ آیت پیش کرتی ہے جہاں تردید کے عین درمیان بی بی مریم کو "صدّیقہ" کہہ کر ان کی عظمت کا اعتراف کیا گیا ہے۔

یہ مطالعہ چار بنیادی سوالات کے گرد گھومتا ہے:

1. قرآن و عقل کی رو سے وہ کون سی شرائط ہیں جن کے بغیر کوئی ہستی "الٰہ" کہلانے کی مستحق نہیں؟
2. الوہیت مسیحؑ کے حق میں مسیحی روایت کون سے بنیادی مقدمات پیش کرتی ہے اور ان مقدمات کا تاریخی ارتقاء کیسے ہوا؟
3. آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کا استدلال کس منطقی ڈھانچے پر قائم ہے؟
4. کیا مسیحی الٰہیات کا "دو فطرتوں" والا جواب اس قرآنی استدلال کو رد کر سکتا ہے یا وہ خود ایک ایسے فکری معضلے میں جا گرتا ہے جس سے نکلنے کا کوئی راستہ نہیں؟

اس تحقیقی مضمون میں تحلیلی، تقابلی اور استنباطی منہج اختیار کیا گیا ہے۔ قرآنی آیات کی تفسیر کے لیے کلاسیکی اور جدید دونوں طرح کی تفاسیر سے براہ راست استفادہ کیا گیا ہے۔ مسیحی موقف کو کسی مخالف کے بیان کے بجائے خود مسیحی روایت کے مستند ماخذ، یعنی کلیسائی مجالس کے فیصلوں، آبائے کلیسا کی تحریروں اور جدید مسیحی الٰہیات دانوں کی کتب سے پیش کیا گیا ہے تاکہ تنقید کسی خیالی مخالف پر نہیں بلکہ اصل موقف پر ہو۔ بائبل کے حوالہ جات کنگ جیمز ورژن (King James Version) سے دیئے گئے ہیں اور ان کا اردو مفہوم مقالہ نگار کا اپنا ہے۔

تصور الٰہ: لغوی، قرآنی اور کلامی تحقیق

لفظ "الٰہ" کی لغوی تحقیق

عربی لغت میں لفظ "إله" کا مادہ "أ ل ھ" ہے۔ امام ابن فارسؒ کے مطابق اس مادے کی اصل "عبادت" کے مفہوم میں ہے، اور "الإله" سے مراد وہ ہستی ہے جس کی عبادت کی جائے[3]۔ ابن منظورؒ نے "لسان العرب" میں لکھا ہے کہ "أَلَهَ يَأْلَهُ إِلَاهَةً" کا مطلب ہے عبادت کرنا، اور اسی سے "إله" بروزن "فِعَال" بمعنیٰ "مَفْعُول" یعنی "معبود" ہے[4]۔ بعض اہل لغت نے اسے "وَلَهَ" سے بھی جوڑا ہے، جس کے معنی شدت محبت میں حیران و سرگشتہ ہو جانے کے ہیں گویا الٰہ وہ ہے جس کی طرف دل بے اختیار کھنچیں اور جس کی معرفت میں عقلیں حیران رہ جائیں۔ امام راغب اصفہانیؒ نے ان دونوں پہلوؤں کو جمع کیا ہے[5]۔

ان لغوی تحقیقات سے ایک اہم نکتہ سامنے آتا ہے: "الٰہ" محض ایک بڑی، طاقتور یا مقدس ہستی کا نام نہیں بلکہ اس ہستی کا نام ہے جو عبادت کی مستحق ہو، یعنی جس کے آگے انسان اپنی کامل احتیاج اور کامل بندگی کا اظہار کرے۔ اور عبادت کا استحقاق صرف اسی کو ہو سکتا ہے جو خود ہر احتیاج سے بالاتر ہو۔ یہی سے الوہیت اور غنا (بے نیازی) کا وہ بنیادی رشتہ قائم ہوتا ہے جو اس پورے آرٹیکل کا مرکزی نکتہ ہے۔ جو خود محتاج ہو وہ دوسرے کی احتیاج کا آخری سہارا نہیں بن سکتا اور جو آخری سہارا نہ ہو اس کے آگے کامل بندگی کا اظہار عقل کے خلاف ہے۔

قرآن مجید میں تصور الٰہ

قرآن مجید میں لفظ "الٰہ" اپنی مختلف صورتوں میں بکثرت آیا ہے اور اس کا استعمال ایک واضح فکری ترتیب رکھتا ہے۔ قرآن کبھی اسے مشرکین کے باطل معبودوں کے لیے استعمال کرتا ہے، جیسے حضرت ابراہیمؑ کا اپنے والد سے سوال: ﴿أَتَتَّخِذُ أَصْنَامًا آلِهَةً﴾[6]، اور کبھی اللہ تعالیٰ کی ذات کے لیے جیسے ﴿وَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ لَّا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الرَّحْمَٰنُ الرَّحِيمُ﴾[7]۔ گویا قرآن کے نزدیک "الٰہ" ایک منصب ہے جس کا دعویٰ تو بہت سی ہستیوں کے لیے کیا گیا مگر اس منصب کا حقیقی اور واحد مستحق صرف اللہ ہے۔ اسی لیے کلمۂ توحید "لا إله إلا الله" میں پہلے ہر دعوے دار سے اس منصب کی نفی کی جاتی ہے اور پھر اسے صرف ایک ذات کے لیے ثابت کیا جاتا ہے۔

قرآن کا اسلوب یہ ہے کہ وہ کسی ہستی کی الوہیت کا انکار محض حکم کے طور پر نہیں کرتا بلکہ ہر بار یہ دکھاتا ہے کہ وہ ہستی الوہیت کی کسی بنیادی شرط پر پوری نہیں اترتی۔ بتوں کے بارے میں وہ کہتا ہے کہ وہ کچھ پیدا نہیں کرتے بلکہ خود پیدا کیے گئے ہیں۔ ستاروں کے بارے میں حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے کہتا ہے کہ وہ ڈوب جاتے ہیں۔ اور حضرت مسیحؑ کے بارے میں کہتا ہے کہ وہ کھانا کھاتے تھے۔ یہ سب ایک ہی منہج کی مختلف صورتیں ہیں۔ پہلے الوہیت کی شرط متعین کرو، پھر دعوے دار کو اس شرط پر پرکھو۔ یہی "منہج شرائط" ہے جسے ہم آگے تفصیل سے بیان کریں گے۔

متکلمین کے ہاں تصور الٰہ

اسلامی علم کلام نے قرآن کے اسی منہج کو ایک منظم عقلی نظام کی صورت دی۔ متکلمین نے کائنات کی ہر چیز کو "ممکن" قرار دیا یعنی ایسی چیز جس کا ہونا اور نہ ہونا دونوں عقلاً برابر ہیں اور جسے وجود میں آنے کے لیے کسی دوسرے کی ضرورت ہے۔ اس کے مقابلے میں اللہ تعالیٰ کو "واجب الوجود" قرار دیا یعنی وہ ذات جس کا نہ ہونا عقلاً محال ہے اور جو اپنے وجود میں کسی کا محتاج نہیں[8]۔ مسلم فلاسفہ میں ابن سیناؒ نے اسی تقسیم کو "برہان امکان" کی صورت میں پیش کیا۔ اگر ہر موجود ممکن ہو تو ممکنات کا پورا سلسلہ خود اپنے وجود کی توجیہ نہیں کر سکتا لہٰذا ایک ایسی ذات کا ہونا لازم ہے جو بذات خود واجب ہو[9]۔

یہاں ایک نکتہ خاص طور پر قابل غور ہے۔ "واجب الوجود" اور "محتاج" دو متضاد صفات ہیں جو ایک ذات میں ایک ہی جہت سے جمع نہیں ہو سکتیں۔ جو ذات کسی بھی پہلو سے محتاج ہو، وہ اس پہلو سے ممکن ہے اور جو ممکن ہو وہ واجب نہیں۔ یہ اصول اسلامی علم کلام کے ساتھ خاص نہیں، قرون وسطیٰ کی مسیحی الٰہیات بھی اسی اصول کو تسلیم کرتی ہے۔ تھامس ایکوناس (Thomas Aquinas) نے خدا کو "خالص فعلیت" (Actus Purus) قرار دیا یعنی ایسی ذات جس میں کوئی امکان، کوئی کمی اور کوئی تغیر نہیں[10]۔ یہی وہ مشترک بنیاد ہے جس پر آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کا استدلال کھڑا ہے اور یہی وجہ ہے کہ یہ استدلال مسیحی ذہن کے لیے بھی اجنبی نہیں بلکہ خود اس کے اپنے اصولوں کی زبان میں گفتگو کرتا ہے۔

الوہیت کی لازمی شرائط: قرآن اور عقل کی روشنی میں

یہاں ان صفات کا جائزہ لیا جائے گا جن کا کسی ہستی میں پایا جانا اس کے الٰہ ہونے کے لیے لازم ہے۔ یہاں "شرط" سے مراد وہ صفت ہے جس کے نہ ہونے سے الوہیت کی نفی لازم آئے یعنی یہ صفات الوہیت کے لیے کافی نہیں بلکہ ضروری ہیں۔ اگر کسی ہستی میں ان میں سے ایک بھی صفت مفقود ہو تو وہ الٰہ نہیں ہو سکتی، چاہے اس میں باقی تمام کمالات موجود ہوں۔ ہر شرط کو قرآنی نص اور عقلی دلیل دونوں سے ثابت کیا جائے گا۔

پہلی شرط: وجوب وجود

الٰہ کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اس کا وجود ذاتی ہو، کسی دوسرے سے مستعار نہ ہو۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ کے بارے میں فرماتا ہے: ﴿هُوَ الْأَوَّلُ وَالْآخِرُ وَالظَّاهِرُ وَالْبَاطِنُ﴾[11]۔ "الاول" کا مطلب یہ ہے کہ اس سے پہلے کچھ نہیں تھا جس سے اس نے وجود پایا ہو۔ عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر الٰہ کا وجود کسی اور سے ہو تو وہ "اور" اس سے مقدم اور اس پر حاکم ہو گا اور حقیقی الوہیت اسی "اور" کے لیے ثابت ہو گی، نہ کہ اس مستعار وجود والی ہستی کے لیے۔ جو اپنے وجود میں کسی کا مرہون منت ہو، وہ اپنی بقا کی ضمانت خود نہیں دے سکتا اور جو اپنی بقا کی ضمانت نہ دے سکے، وہ دوسروں کی بقا کا آخری سہارا کیسے بن سکتا ہے؟

دوسری شرط: ازلیت وابدیت

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ہمیشہ سے ہو اور ہمیشہ رہے۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے: ﴿كُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ ۝ وَيَبْقَىٰ وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْإِكْرَامِ﴾[12]۔ اسی طرح فرمایا: ﴿وَتَوَكَّلْ عَلَى الْحَيِّ الَّذِي لَا يَمُوتُ﴾[13]۔ اس آیت میں توکل کی بنیاد ہی "لایموت" کو بنایا گیا ہے یعنی بھروسہ اسی پر کیا جا سکتا ہے جس پر موت طاری نہ ہو۔ عقلی طور پر جس چیز کی ابتدا ہو، وہ حادث ہے اور حادث کو کسی محدث کی ضرورت ہے اور جس پر فنا طاری ہو سکے اس کا وجود اس کی ذات کا لازمہ نہیں ورنہ اس کا معدوم ہونا محال ہوتا۔

قرآن مجید نے اسی شرط کو حضرت مسیحؑ کے معاملے پر براہ راست منطبق کیا ہے: ﴿قُلْ فَمَن يَمْلِكُ مِنَ اللَّهِ شَيْئًا إِنْ أَرَادَ أَن يُهْلِكَ الْمَسِيحَ ابْنَ مَرْيَمَ وَأُمَّهُ وَمَن فِي الْأَرْضِ جَمِيعًا﴾[14]۔ یہ آیت ایک عقلی امکان کی طرف اشارہ کرتی ہے: حضرت مسیحؑ کا ہلاک کیا جا سکنا ممکن ہے اور جس کا ہلاک ہونا ممکن ہو وہ الٰہ نہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ یہاں بھی آیت 75 کی طرح بی بی مریم کو حضرت مسیحؑ کے ساتھ ذکر کیا گیا ہے گویا یہ بتانا مقصود ہے کہ وجودی لحاظ سے دونوں ایک ہی صف میں کھڑے ہیں۔

تیسری شرط: غنائے مطلق (کامل بے نیازی)

یہ وہ شرط ہے جس پر اس آرٹیکل کا سارا استدلال قائم ہے، اس لیے اس پر قدرے تفصیل سے گفتگو ضروری ہے۔ قرآن مجید اللہ تعالیٰ اور انسان کے درمیان بنیادی فرق یوں بیان کرتا ہے: ﴿يَا أَيُّهَا النَّاسُ أَنتُمُ الْفُقَرَاءُ إِلَى اللَّهِ ۖ وَاللَّهُ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيدُ﴾[15]۔ اس آیت میں دو حصر ہیں: انسان ہی محتاج ہیں اور اللہ ہی غنی ہے۔ سورۂ اخلاص میں اللہ تعالیٰ کو ﴿الصَّمَدُ﴾ کہا گیا[16] اور مفسرین نے اس کے دو بنیادی معنی بیان کیے ہیں: وہ ذات جس کی طرف سب اپنی حاجات میں رجوع کریں اور جس کا کام سب کے بغیر ہونا ممکن ہو اور وہ ذات جس کا کوئی پیٹ نہ ہو یعنی جو کھانے پینے سے پاک ہو۔ امام طبریؒ نے اس دوسرے معنی کو متعدد سلف سے نقل کیا ہے[17]۔ یہ معنی اس بات کی واضح دلیل ہے کہ صحابہ و تابعین کے ذہن میں "کھانے سے پاک ہونا" الوہیت کی ایک بنیادی صفت کے طور پر موجود تھا۔

اس سے بھی زیادہ صریح آیت سورۂ انعام کی ہے: ﴿قُلْ أَغَيْرَ اللَّهِ أَتَّخِذُ وَلِيًّا فَاطِرِ السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضِ وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾[18]۔ یہاں "یُطعِم ولا یُطعَم" (وہ کھلاتا ہے اور اسے کھلایا نہیں جاتا) کو ولایت اور الوہیت کی دلیل بنایا گیا ہے۔ یہ آیت گویا آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کا عکس کامل ہے۔ الٰہ وہ ہے جو کھلاتا ہے اور جو کھاتا ہے وہ الٰہ نہیں۔ اسی طرح فرمایا: ﴿مَا أُرِيدُ مِنْهُم مِّن رِّزْقٍ وَمَا أُرِيدُ أَن يُطْعِمُونِ﴾[19]۔

عقلی طور پر غنا کی شرط اس لیے لازم ہے کہ احتیاج نقص ہے اور نقص الوہیت کے منافی ہے۔ مزید یہ کہ جو کسی چیز کا محتاج ہو، وہ اپنے کمال میں اس چیز پر منحصر ہے اور جو کسی پر منحصر ہو، وہ اُس کے مقابلے میں ناقص ہے۔ اگر الٰہ کسی بھی چیز کا محتاج ہو تو وہ چیز اس کے کمال کی شرط بن جائے گی اور یوں وہ چیز ایک لحاظ سے الٰہ پر حاکم ٹھہرے گی۔ یہ صورت عقلاً محال ہے۔

یہاں یہ بات خاص طور پر قابل ذکر ہے کہ بائبل کا عہد نامۂ قدیم بھی اسی اصول کو تسلیم کرتا ہے۔ زبور میں خدا کی زبان سے کہا گیا ہے کہ اگر میں بھوکا ہوتا تو تجھ سے نہ کہتا، کیونکہ دنیا اور اس کی معموری میری ہی ہے۔ کیا میں بیلوں کا گوشت کھاتا ہوں یا بکریوں کا خون پیتا ہوں؟[20] یہ سوالیہ انداز خود اس بات کا اعلان ہے کہ کھانا خدا کی شان کے منافی ہے۔ گویا قرآن کی آیت ﴿وَهُوَ يُطْعِمُ وَلَا يُطْعَمُ﴾ اور زبور کا یہ بیان ایک ہی حقیقت کی دو گواہیاں ہیں اور اسی مشترک حقیقت پر آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کا استدلال قائم ہے۔

چوتھی شرط: قدرت مطلقہ

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر ممکن چیز پر قادر ہو اور اس کی قدرت کسی دوسرے کی اجازت کی محتاج نہ ہو۔ قرآن مجید بار بار اعلان کرتا ہے: ﴿إِنَّ اللَّهَ عَلَىٰ كُلِّ شَيْءٍ قَدِيرٌ﴾[21]۔ اس کے مقابلے میں حضرت مسیحؑ کے معجزات کا ذکر کرتے ہوئے قرآن ہر معجزے کے ساتھ ایک قید لگاتا ہے: ﴿بِإِذْنِ اللَّهِ﴾۔ مٹی سے پرندہ بنانا، اندھے اور کوڑھی کو شفا دینا، مردے کو زندہ کرنا، سب "اللہ کے اذن سے" ہے[22]۔ یہ تکرار محض اسلوبی نہیں بلکہ ایک عقیدتی اعلان ہے۔ یہ قدرت ذاتی نہیں، عطائی ہے اور عطائی قدرت رکھنے والا قادر مطلق نہیں ہوتا۔

عقلی دلیل یہ ہے کہ اگر دو ہستیاں قادر مطلق ہوں اور ایک کسی چیز کو حرکت دینا چاہے اور دوسری ساکن رکھنا چاہے، تو یا دونوں کا ارادہ پورا ہو گا (جو اجتماع نقیضین ہے)، یا کسی کا نہیں ہو گا (جو دونوں کے عجز کی دلیل ہے)، یا ایک کا پورا ہو گا (تو دوسرا قادر مطلق نہیں رہا)۔ یہ متکلمین کا معروف "برہان تمانع" ہے، جس کی اصل قرآن کی آیت میں ہے جس کا ذکر ساتویں شرط کے تحت آئے گا۔ انجیل میں خود حضرت مسیحؑ کا یہ قول منقول ہے کہ میں اپنے آپ سے کچھ نہیں کر سکتا[23]، جو عطائی قدرت کا صریح اعتراف ہے۔

پانچویں شرط: علم محیط

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ اس کا علم ہر چیز کو محیط ہو، ظاہر کو بھی اور پوشیدہ کو بھی۔ قرآن مجید فرماتا ہے: ﴿عَالِمِ الْغَيْبِ ۖ لَا يَعْزُبُ عَنْهُ مِثْقَالُ ذَرَّةٍ فِي السَّمَاوَاتِ وَلَا فِي الْأَرْضِ﴾[24]۔ عقلی طور پر جو خالق ہو، اس کا اپنی مخلوق سے بے خبر ہونا محال ہے، جیسا کہ فرمایا: ﴿أَلَا يَعْلَمُ مَنْ خَلَقَ وَهُوَ اللَّطِيفُ الْخَبِيرُ﴾[25]۔ اور جو کائنات کا مدبّر ہو، اس کا کسی گوشے سے ناواقف ہونا اس کی تدبیر کو ناقص بنا دیتا ہے۔

اس شرط کے تناظر میں قرآن حضرت مسیحؑ کی زبان سے قیامت کے دن یہ اعتراف نقل کرتا ہے: ﴿تَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِي وَلَا أَعْلَمُ مَا فِي نَفْسِكَ﴾[26]۔ اور انجیل مرقس میں خود حضرت مسیحؑ کا یہ قول درج ہے کہ اُس دن اور اُس گھڑی کو کوئی نہیں جانتا، نہ آسمان کے فرشتے، نہ بیٹا، مگر صرف باپ[27]۔ ایک ہستی جو اپنے علم کی حد کا خود اقرار کرے، وہ علم محیط کی شرط پر پوری نہیں اترتی۔

چھٹی شرط: حیات ذاتی اور قیومیت

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ اس کی زندگی ذاتی ہو، کسی سبب کی محتاج نہ ہو اور وہ خود قائم رہنے کے ساتھ ساتھ ساری کائنات کو قائم رکھنے والا ہو۔ آیت الکرسی میں یہ دونوں پہلو یکجا ہیں: ﴿اللَّهُ لَا إِلَٰهَ إِلَّا هُوَ الْحَيُّ الْقَيُّومُ ۚ لَا تَأْخُذُهُ سِنَةٌ وَلَا نَوْمٌ﴾[28]۔ یہاں "لا تأخذه سنة ولا نوم" قیومیت کا لازمی نتیجہ ہے جو کائنات کو ہر لمحہ تھامے ہوئے ہو، اس پر اونگھ یا نیند کا ایک لمحہ بھی کائنات کے بکھر جانے کے مترادف ہو گا۔ نیند کمزوری اور تجدید قوت کی احتیاج کا مظہر ہے اور الٰہ ہر کمزوری سے پاک ہے۔

عہد نامۂ قدیم بھی اسی صفت کو بیان کرتا ہے کہ اسرائیل کا نگہبان نہ اونگھتا ہے نہ سوتا ہے[29] اور یسعیاہ نبی کے صحیفے میں ہے کہ ابدی خدا نہ تھکتا ہے نہ ماندہ ہوتا ہے[30]۔ اس کے برعکس انجیل خود بیان کرتی ہے کہ حضرت مسیحؑ سفر سے تھک کر کنویں پر بیٹھ گئے[31] اور طوفان کے دوران کشتی کے پچھلے حصے میں سو رہے تھے[32]۔ یوں بائبل کا اپنا بیان کردہ معیار اور بائبل کا اپنا بیان کردہ مسیح ایک دوسرے سے ہم آہنگ نظر نہیں آتے۔

ساتویں شرط: وحدانیت اور عدم شرکت

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ایک ہو اور اس کی الوہیت میں کوئی شریک نہ ہو۔ قرآن مجید نے اس پر دو بنیادی عقلی دلائل دیئے ہیں۔ پہلا: ﴿لَوْ كَانَ فِيهِمَا آلِهَةٌ إِلَّا اللَّهُ لَفَسَدَتَا﴾[33]۔ دوسرا: ﴿مَا اتَّخَذَ اللَّهُ مِن وَلَدٍ وَمَا كَانَ مَعَهُ مِنْ إِلَٰهٍ ۚ إِذًا لَّذَهَبَ كُلُّ إِلَٰهٍ بِمَا خَلَقَ وَلَعَلَا بَعْضُهُمْ عَلَىٰ بَعْضٍ﴾[34]۔ پہلی آیت کائنات کے نظم کو دلیل بناتی ہے اور دوسری اقتدار کی فطرت کو۔ اگر متعدد الٰہ ہوں تو یا ان میں سے ہر ایک کا اپنا الگ دائرہ ہو گا (تو کوئی بھی کامل الٰہ نہ رہا)، یا ان میں کشمکش ہو گی (تو مغلوب الٰہ نہ رہا)۔

یہاں ایک دقیق نکتہ قابل غور ہے۔ سورۂ مومنون کی آیت میں "ولد" اور "الٰہ" کا ذکر ایک ساتھ کیا گیا ہے۔ گویا قرآن یہ بتانا چاہتا ہے کہ اگر کسی کو خدا کا بیٹا اس معنی میں مانا جائے کہ وہ خدا کی ذات میں شریک ہو، تو یہ عملاً دوسرا الٰہ ماننے کے مترادف ہے، چاہے اسے "ایک ہی جوہر" کہہ کر چھپانے کی کوشش کی جائے۔ مسیحی الٰہیات کا دعویٰ ہے کہ باپ، بیٹا اور روح القدس تین "اقانیم" ہیں مگر ایک خدا ہیں۔ قرآن نے اس کا جواب ﴿وَمَا مِنْ إِلَٰهٍ إِلَّا إِلَٰهٌ وَاحِدٌ﴾[35] کے ذریعے دیا، جس میں "مِن" استغراقیہ ہر قسم کی کثرت کی نفی کرتا ہے، چاہے وہ اقنوموں کی صورت میں ہو یا ذوات کی صورت میں۔

آٹھویں شرط: تنزیہ۔ جسمانیت، تغیر اور حدوث سے پاکی

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ وہ جسم، ترکیب، مکان اور تغیر سے پاک ہو۔ قرآن کا جامع اعلان ہے: ﴿لَيْسَ كَمِثْلِهِ شَيْءٌ ۖ وَهُوَ السَّمِيعُ الْبَصِيرُ﴾[36]۔ جسم اجزا سے مرکب ہوتا ہے، اور مرکب اپنے اجزا کا محتاج ہوتا ہے۔ جسم مکان گھیرتا ہے اور مکان کا محتاج ہوتا ہے۔ جسم بدلتا ہے اور ہر تغیر حدوث کی علامت ہے۔

تغیر کے بارے میں قرآن کا سب سے خوبصورت استدلال حضرت ابراہیمؑ کی زبان سے آیا ہے۔ جب ستارہ، چاند اور سورج ڈوب گئے تو آپؑ نے فرمایا: ﴿لَا أُحِبُّ الْآفِلِينَ﴾[37]۔ امام رازیؒ نے اس آیت کی تفسیر میں لکھا ہے کہ غروب ہونا ایک حالت سے دوسری حالت کی طرف منتقل ہونا ہے، اور جو حالات کے تغیر کا محل بنے وہ حادث ہے، اور حادث الٰہ نہیں ہو سکتا[38]۔ یعنی حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کو ان کی چمک یا عظمت کی بنیاد پر نہیں بلکہ ان کے تغیر کی بنیاد پر الوہیت سے خارج کیا۔ بالکل یہی منہج آیت ﴿كَانَا

يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ میں اختیار کیا گیا ہے کیونکہ کھانا بدن کو ایک حالت سے دوسری حالت میں لے جاتا ہے۔ بھوک سے سیری اور سیری سے پھر بھوک کی طرف۔

بائبل بھی خدا کے لاتغیر ہونے کا اعلان کرتی ہے۔ "میں خداوند ہوں، میں بدلتا نہیں"[39]۔ اسی طرح کہا گیا کہ خدا انسان نہیں[40]۔ یہ نصوص مسیحی الٰہیات کے لیے ایک بنیادی چیلنج ہیں کیونکہ عقیدۂ تجسیم (Incarnation) کا لازمی نتیجہ یہ ہے کہ خدا نے "انسان بن کر" ایک نئی حالت اختیار کی اور نئی حالت اختیار کرنا ہی تغیر ہے۔

نویں شرط: خالقیت وربوبیت

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ وہ خالق ہو، مخلوق نہ ہو۔ قرآن مجید نے اسے الوہیت کی سب سے نمایاں کسوٹی قرار دیا ہے: ﴿أَفَمَن يَخْلُقُ كَمَن لَّا يَخْلُقُ ۗ أَفَلَا تَذَكَّرُونَ﴾[41]۔ اور اس سے آگے بڑھ کر فرمایا: ﴿وَالَّذِينَ يَدْعُونَ مِن دُونِ اللَّهِ لَا يَخْلُقُونَ شَيْئًا وَهُمْ يُخْلَقُونَ ۝ أَمْوَاتٌ غَيْرُ أَحْيَاءٍ ۖ وَمَا يَشْعُرُونَ أَيَّانَ يُبْعَثُونَ﴾[42]۔ ان دو آیات میں چار شرائط یکجا ہیں۔ خالق ہونا، مخلوق نہ ہونا، زندہ ہونا اور غیب کا علم رکھنا۔ یہ آیت گویا الوہیت کی شرائط کا ایک جامع خلاصہ ہے۔

حضرت مسیحؑ کے معاملے میں قرآن کا جواب سادہ اور فیصلہ کن ہے: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ ۖ خَلَقَهُ مِن تُرَابٍ ثُمَّ قَالَ لَهُ كُن فَيَكُونُ﴾[43]۔ یعنی مسیحؑ کی ولادت کا انوکھا ہونا ان کے مخلوق ہونے کی نفی نہیں کرتا بلکہ اسی فعل "کن" کا ایک مظہر ہے جس سے حضرت آدمؑ بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے۔

دسویں شرط: نفع وضرر کی مالکیت

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ وہ نفع ونقصان کا حقیقی مالک ہو، کیونکہ عبادت کی بنیاد ہی امید اور خوف ہے، اور امید وخوف اسی سے وابستہ ہو سکتے ہیں جو نفع وضرر کا مالک ہو۔ قابل غور بات یہ ہے کہ آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کے فوراً بعد اگلی آیت یہی شرط بیان کرتی ہے: ﴿قُلْ أَتَعْبُدُونَ مِن دُونِ اللَّهِ مَا لَا يَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَلَا نَفْعًا ۚ وَاللَّهُ هُوَ السَّمِيعُ الْعَلِيمُ﴾[44]۔ یہ ترتیب نہایت معنی خیز ہے۔ پہلے یہ دکھایا کہ مسیحؑ خود محتاج ہیں (کھانا کھاتے تھے) پھر اس سے لازمی نتیجہ نکالا کہ جو خود محتاج ہو وہ دوسروں کے نفع وضرر کا مالک نہیں ہو سکتا۔ ان دونوں آیات کا باہمی ربط اس استدلال کو ایک مکمل منطقی سلسلہ بنا دیتا ہے۔

گیارہویں شرط: والد وولد سے پاکی

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ نہ وہ کسی سے پیدا ہو اور نہ اس سے کوئی پیدا ہو۔ سورۂ اخلاص کا اعلان ہے: ﴿لَمْ يَلِدْ وَلَمْ يُولَدْ﴾[45]۔ اور اس کی عقلی دلیل سورۂ انعام میں دی گئی: ﴿بَدِيعُ السَّمٰوَاتِ وَالْأَرْضِ ۖ أَنَّىٰ يَكُونُ لَهُ وَلَدٌ وَلَمْ تَكُن لَّهُ صَاحِبَةٌ ۖ وَخَلَقَ كُلَّ شَيْءٍ﴾[46]۔ عقلی طور پر "ولادت" کا مطلب ہے کسی ذات کے جزو کا اس سے جدا ہو کر ایک مستقل وجود اختیار کرنا اور یہ صرف مرکب اور منقسم ہستی کے لیے ممکن ہے۔ اولاد کی خواہش بقا کی احتیاج سے پیدا ہوتی ہے کیونکہ فانی ہستی اپنی نسل میں باقی رہنا چاہتی ہے۔ اور جو ازلی وابدی ہو اسے اس کی کوئی ضرورت نہیں۔

مسیحی الٰہیات اس کے جواب میں یہ کہتی ہے کہ بیٹے کی "ولادت" جسمانی نہیں، بلکہ ازلی اور روحانی ہے (eternal generation)۔ لیکن یہ تعبیر مسئلے کو حل نہیں کرتی کیونکہ اگر بیٹا باپ سے "صادر" ہوا ہے تو وہ اپنے وجود میں باپ کا محتاج ہے

اور اگر محتاج نہیں تو "ولادت" کا لفظ بے معنی ہو جاتا ہے۔ یہی وہ داخلی تناؤ تھا جس نے چوتھی صدی میں آریوس (Arius) کو یہ کہنے پر مجبور کیا کہ بیٹا ازلی نہیں ہو سکتا[47]۔

بارہویں شرط: دعا کا سننا اور قبول کرنا

الٰہ کے لیے لازم ہے کہ وہ ہر پکارنے والے کی پکار ہر وقت اور ہر جگہ سنے اور اسے قبول کرنے پر قادر ہو۔ قرآن مجید میں اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں: ﴿أَمَّن يُجِيبُ الْمُضْطَرَّ إِذَا دَعَاهُ وَيَكْشِفُ السُّوءَ﴾[48]۔ اور غیر اللہ کو پکارنے والوں کے بارے میں فرمایا: ﴿وَمَنْ أَضَلُّ مِمَّن يَدْعُو مِن دُونِ اللَّهِ مَن لَّا يَسْتَجِيبُ لَهُ إِلَىٰ يَوْمِ الْقِيَامَةِ﴾[49]۔ جو خود دعا کرنے والا ہو، وہ دعا قبول کرنے والا نہیں ہو سکتا۔ انجیل میں حضرت مسیحؑ کا بار بار دعا کرنا حتیٰ کہ صلیب کے واقعے سے پہلے گتسمنی کے باغ میں گڑگڑا کر دعا کرنا، اس بات کی گواہی ہے کہ وہ دعا کرنے والوں کی صف میں تھے، دعا قبول کرنے والے کے مقام پر نہیں[50]۔

ان بارہ شرائط پر غور کیا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ الگ الگ اور منتشر صفات نہیں بلکہ ایک ہی بنیادی حقیقت کی مختلف جہتیں ہیں۔ اور وہ حقیقت ہے "غنائے مطلق"۔ واجب الوجود وہ ہے جو اپنے وجود میں بے نیاز ہو۔ ازلی و ابدی وہ ہے جو اپنی بقا میں بے نیاز ہو۔ قادر مطلق وہ ہے جو اپنے فعل میں بے نیاز ہو، علیم کل وہ ہے جو اپنے علم میں بے نیاز ہو۔ حی و قیوم وہ ہے جو اپنی حیات میں بے نیاز ہو۔ واحد وہ ہے جو اپنی الوہیت میں کسی شریک سے بے نیاز ہو۔ منزّہ وہ ہے جو جسم و مکان سے بے نیاز ہو اور "لم یلد ولم یولد" وہ ہے جو اصل اور نسل دونوں سے بے نیاز ہو۔

اس تجزیے کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ اگر کسی ہستی میں احتیاج کا ایک پہلو بھی ثابت ہو جائے تو باقی تمام شرائط بھی متزلزل ہو جاتی ہیں، کیونکہ وہ سب غناہی کی شاخیں ہیں۔ یہی وہ نکتہ ہے جو آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کو غیر معمولی بنا دیتا ہے۔

الوہیت مسیحؑ کے مسیحی مقدمات: تاریخی ارتقاء اور کلامی ساخت

کسی موقف پر علمی تنقید کی پہلی شرط یہ ہے کہ اسے اس کی بہترین اور مضبوط ترین صورت میں پیش کیا جائے۔ اس بحث میں پہلے الوہیت مسیحؑ کے عقیدے کے تاریخی ارتقاء کا مختصر جائزہ لیا جائے گا اور پھر ان چھ بنیادی مقدمات کو بیان کیا جائے گا جن پر مسیحی روایت اس عقیدے کی بنیاد رکھتی ہے۔

عقیدے کا تاریخی ارتقاء: نیقیہ سے خلقیدون تک

جدید مسیحی اور غیر مسیحی محققین کی ایک بڑی تعداد اس بات پر متفق ہے کہ حضرت مسیحؑ کی الوہیت کا عقیدہ اپنی موجودہ کلامی صورت میں ایک تدریجی ارتقاء کا نتیجہ ہے۔ ابتدائی اناجیل، خصوصاً مرقس، متی اور لوقا (جنہیں "متوافق اناجیل" کہا جاتا ہے)، میں مسیحؑ کی جو تصویر ملتی ہے وہ ایک برگزیدہ نبی، مسیحا اور خدا کے مقرب بندے کی ہے جبکہ یوحنا کی انجیل میں جو سب سے آخر میں لکھی گئی، "کلمہ" اور "باپ کے ساتھ وحدت" کے تصورات نمایاں ہوتے ہیں۔ برطانوی مسیحی عالم جیمز ڈن (James D. G. Dunn) نے اپنی معروف تحقیق میں اسی تدریجی ارتقاء کا مطالعہ کیا ہے[51] اور امریکی محقق بارٹ ارمن (Bart D. Ehrman) نے بھی اس موضوع پر ایک مفصل کتاب لکھی ہے جس کا عنوان ہی اس ارتقاء کی طرف اشارہ کرتا ہے[52]۔

اس ارتقاء کا پہلا بڑا موڑ 325ء میں نیقیہ (Nicaea) کی کونسل تھی۔ اسکندریہ کے ایک پادری آریوس (Arius) کا موقف تھا کہ بیٹا باپ کی مخلوق ہے اگرچہ تمام مخلوقات میں سب سے اعلیٰ ہے اور ایک وقت ایسا تھا جب وہ موجود نہیں تھا۔ اس کے مقابلے میں

اثناسیوس (Athanasius) اور اس کے ہم خیال گروہ کا اصرار تھا کہ بیٹا باپ کا "ہم جوہر" (homoousias) ہے۔ رومی شہنشاہ قسطنطین کی سرپرستی میں منعقد ہونے والی اس کونسل نے دوسرا موقف اختیار کیا اور آریوس کو بدعتی قرار دیا[53]۔ پھر 381ء میں قسطنطنیہ کی کونسل نے روح القدس کو بھی اسی الوہیت میں شامل کر کے تثلیث کے عقیدے کو مکمل کیا۔

لیکن ان فیصلوں نے ایک نیا سوال کھڑا کر دیا۔ اگر مسیحؑ کامل خدا ہیں اور کامل انسان بھی، تو یہ دونوں حقیقتیں ایک شخصیت میں کیسے جمع ہیں؟ اس سوال پر پانچویں صدی میں شدید اختلاف ہوا۔ قسطنطنیہ کے بطریق نسطوریوس (Nestorius) کا کہنا تھا کہ مسیحؑ میں الوہیت اور انسانیت دو الگ حقیقتیں ہیں جو ایک دوسرے سے متصل ہیں، لہٰذا بی بی مریم کو "ام الٰہ" (Theotokos) نہیں کہا جا سکتا، کیونکہ انہوں نے صرف انسانی مسیح کو جنا تھا۔ اسکندریہ کے بطریق سیرل (Cyril of Alexandria) نے اس کی شدید مخالفت کی اور اصرار کیا کہ مسیحؑ ایک ہی شخصیت ہیں اور وہی ایک شخصیت یعنی خدا کا کلمہ، جسم میں پیدا ہوا اور جسم میں دکھ اٹھایا۔ سیرل کے بارہ "حرومات" (anathemas) میں سے آخری یہی تھا کہ جو یہ اقرار نہ کرے کہ خدا کے کلمے نے جسم میں دکھ اٹھایا اور جسم میں موت کا مزہ چکھا، وہ ملعون ہے[54]۔ 431ء میں افسس (Ephesus) کی کونسل نے نسطوریوس کو معزول کر دیا۔

بالآخر 451ء میں خلقیدون (Chalcedon) کی کونسل نے وہ تعریف وضع کی جو آج تک کیتھولک، آرتھوڈوکس اور بیشتر پروٹسٹنٹ کلیساؤں کا مسلّمہ عقیدہ ہے۔ مسیحؑ ایک "اقنوم" (person/hypostasis) ہیں جن میں دو "فطرتیں" (natures)، الٰہی اور انسانی، بغیر اختلاط، بغیر تبدیلی، بغیر تقسیم اور بغیر جدائی کے جمع ہیں[55]۔ یہ تعریف اس بحث کے لیے خصوصی اہمیت رکھتی ہے کیونکہ آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کے استدلال پر مسیحی الٰہیات کا سب سے مضبوط جواب اسی تعریف پر قائم ہے۔

مقدمہ اُولیٰ: کنواری ولادت

الوہیت مسیحؑ کی تائید میں سب سے زیادہ عوامی سطح پر پیش کی جانے والی دلیل یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے۔ انجیل متی اور انجیل لوقا دونوں میں اس ولادت کا ذکر ہے[56]۔ استدلال یہ ہے کہ جب ان کا کوئی انسانی باپ نہیں، تو ان کا باپ خود خدا ہے اور جو خدا کا بیٹا ہو وہ خدا کی فطرت میں شریک ہے۔ قابل ذکر بات یہ ہے کہ قرآن مجید بھی کنواری ولادت کو پوری قوت سے تسلیم کرتا ہے[57]۔ اختلاف واقعے میں نہیں، بلکہ اس سے نکالے گئے نتیجے میں ہے۔

مقدمہ ثانیہ: معجزات

دوسری دلیل یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ نے ایسے معجزات دکھائے جو صرف خدا کی شان ہیں۔ مردوں کو زندہ کرنا، اندھوں کو بینائی دینا، کوڑھیوں کو شفا دینا، پانی پر چلنا اور طوفان کو تھما دینا۔ انجیل یوحنا میں لعزر (Lazarus) کو، جو چار دن سے قبر میں تھا، زندہ کرنے کا واقعہ خاص طور پر اس دلیل کے لیے پیش کیا جاتا ہے[58]۔ استدلال یہ ہے کہ زندگی دینا خالق کا فعل ہے، اور جو یہ فعل کرے وہ خالق ہے۔

مقدمہ ثالثہ: "ابن اللہ" اور "کلمہ" کے القاب

تیسری دلیل ان القاب سے لی جاتی ہے جو اناجیل میں سیدنا مسیحؑ کے لیے استعمال ہوئے ہیں۔ "ابن اللہ" (Son of God) کا لقب اناجیل میں بار بار آیا ہے۔ اسی طرح انجیل یوحنا کا آغاز اس مشہور جملے سے ہوتا ہے کہ ابتدا میں کلمہ تھا اور کلمہ خدا کے ساتھ تھا اور کلمہ خدا تھا۔ اور پھر آگے کہا گیا کہ کلمہ مجسم ہوا اور ہمارے درمیان رہا[59]۔ یونانی فلسفے میں "لوگوس" (Logos) کا تصور کائنات کے

عقلی اصول کا تھا اور یوحنا کی انجیل نے اسے مسیحؑ پر منطبق کر کے یہ دعویٰ کیا کہ وہ ازلی کلمہ جو خدا کے ساتھ تھا، انسانی جسم میں ظاہر ہوا۔

مقدمہ رابعہ: باپ کے ساتھ وحدت کے دعوے

چوتھی دلیل انجیل یوحنا میں منقول بعض اقوال سے لی جاتی ہے جن میں سب سے مشہور یہ ہے کہ "میں اور باپ ایک ہیں"[60]۔ اسی طرح یہ قول کہ جس نے مجھے دیکھا اس نے باپ کو دیکھا[61] اور توما (Thomas) کا مسیحؑ کو "میرے خداوند اور میرے خدا" کہہ کر پکارنا[62]۔ مسیحی مفسرین ان اقوال کو مسیحؑ کی جانب سے اپنی الوہیت کے براہ راست دعوے کے طور پر پیش کرتے ہیں۔

مقدمہ خامسہ: نجات اور کفارے کی ضرورت

پانچویں دلیل خالص کلامی ہے اور مسیحی الٰہیات میں اسے سب سے زیادہ گہری دلیل سمجھا جاتا ہے۔ اس کا خلاصہ یہ ہے کہ حضرت آدمؑ کے گناہ کی وجہ سے پوری انسانیت گناہ گار ہو گئی اور یہ گناہ چونکہ لامحدود خدا کے خلاف تھا اس لیے اس کی سزا بھی لامحدود ہے۔ کوئی محدود انسان اس لامحدود قرض کو ادا نہیں کر سکتا اور خدا پر یہ قرض واجب نہیں کیونکہ گناہ انسان نے کیا ہے۔ لہٰذا ضروری تھا کہ کوئی ایسی ہستی ہو جو بیک وقت انسان ہو (تاکہ وہ انسانیت کی نمائندگی کر سکے) اور خدا ہو (تاکہ اس کی قربانی لامحدود قدر رکھے)۔ گیارہویں صدی کے مسیحی الٰہیات دان انسلم (Anselm of Canterbury) نے اپنی معروف کتاب "خدا انسان کیوں بنا؟" میں اسی استدلال کو منظم صورت میں پیش کیا[63]۔

مقدمہ سادسہ: عبادت کی قبولیت اور الٰہی اختیارات

چھٹی دلیل یہ ہے کہ اناجیل کے مطابق مسیحؑ نے گناہ معاف کیے، جو صرف خدا کا حق ہے[64]۔ اور بعض مواقع پر لوگوں نے ان کے آگے سجدہ کیا اور انہوں نے منع نہیں کیا۔ اسی طرح یہ کہا گیا کہ قیامت کے دن عدالت انہی کے سپرد ہو گی۔ ان اختیارات کو الوہیت کی علامات کے طور پر پیش کیا جاتا ہے۔

مسیحی موقف کی داخلی تنقید: خود مسیحی روایت کے اندر سے

یہاں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ الوہیت مسیحؑ پر تنقید صرف بیرونی نہیں، بلکہ خود مسیحی علمی روایت کے اندر سے بھی ہوتی رہی ہے۔ 1977ء میں برطانیہ کے سات ممتاز مسیحی الٰہیات دانوں نے معروف فلسفی مذہب جان ہک (John Hick) کی ادارت میں ایک مجموعۂ مقالات شائع کیا جس کا عنوان ہی تجسیم کو ایک "اسطورہ" قرار دیتا تھا[65]۔ جان ہک کا بنیادی استدلال یہ تھا کہ یہ کہنا کہ ایک ہی ہستی بیک وقت لامحدود اور محدود، علیم کُل اور محدود العلم، قادر مطلق اور عاجز ہو، اس وقت تک کوئی قابل فہم مفہوم نہیں رکھتا جب تک اسے حقیقی معنی کے بجائے استعاراتی معنی میں نہ لیا جائے[66]۔ دوسری طرف امریکی فلسفی ٹامس مورس (Thomas V. Morris) نے تجسیم کو منطقی طور پر قابل دفاع ثابت کرنے کے لیے "دو اذہان" (two minds) کا نظریہ پیش کیا[67]، جس کا ذکر آگے آئے گا۔

یہ داخلی بحث اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن نے جس نکتے کی طرف چودہ صدیاں پہلے ایک مختصر جملے میں اشارہ کیا تھا وہ آج بھی مسیحی فلسفۂ مذہب کا ایک زندہ اور حل طلب مسئلہ ہے۔ یعنی یہ سوال کہ ایک ہی ہستی میں الوہیت کی صفات اور انسانیت کی کمزوریاں بیک وقت کیسے جمع ہو سکتی ہیں، جدید مسیحی فلسفی بھی اسے نظر انداز نہیں کر سکے۔

آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کا تفسیری اور بلاغی مطالعہ

﴿مَّا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ ۖ كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ ۗ انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ﴾

"مسیح ابن مریم ایک رسول کے سوا کچھ نہیں، ان سے پہلے بھی بہت سے رسول گزر چکے ہیں، اور ان کی والدہ ایک راست باز خاتون تھیں۔ وہ دونوں کھانا کھایا کرتے تھے۔ دیکھو، ہم کس طرح ان کے سامنے اپنی نشانیاں واضح کرتے ہیں، پھر دیکھو یہ کس طرح الٹے پھرائے جاتے ہیں"[68]۔

سیاق آیات کا فکری مقدمہ

اس آیت کا صحیح فہم اس کے سیاق کے بغیر ممکن نہیں۔ سورۃ المائدۃ کی آیات 72 سے 77 ایک مربوط فکری اکائی ہیں، جن میں قرآن نے مسیحی عقیدے کے ہر پہلو کا ایک منظم جواب دیا ہے۔ آیت 72 میں ان لوگوں کا ذکر ہے جو کہتے ہیں کہ اللہ ہی مسیح ابن مریم ہے یعنی "عقیدہ عینیت / الوہیت مسیح" کے حاملین، اور اسی آیت میں خود حضرت مسیحؑ کی زبان سے ان کا رد نقل کیا گیا: ﴿وَقَالَ الْمَسِيحُ يَا بَنِي إِسْرَائِيلَ اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ﴾[69]۔ یعنی پہلی گواہی خود مسیحؑ کی ہے۔ آیت 73 میں تثلیث کا رد ہے: ﴿لَّقَدْ كَفَرَ الَّذِينَ قَالُوا إِنَّ اللَّهَ ثَالِثُ ثَلَاثَةٍ﴾۔ آیت 74 میں توبہ کی دعوت ہے، جو اس پورے مکالمے کے مقصد کو واضح کرتی ہے۔ مقصد شکست دینا نہیں، بلکہ واپس بلانا ہے۔ آیت 75 میں عقلی دلیل ہے، آیت 76 میں اس دلیل کا عملی نتیجہ (جو نفع وضرر کا مالک نہیں اس کی عبادت کیوں؟)، اور آیت 77 میں اس پوری گمراہی کی تشخیص: ﴿قُلْ يَا أَهْلَ الْكِتَابِ لَا تَغْلُوا فِي دِينِكُمْ غَيْرَ الْحَقِّ﴾[70]۔

اس ترتیب پر غور کیا جائے تو قرآن کا منہج سامنے آتا ہے۔ پہلے دعوے کا بیان، پھر خود اس شخصیت کی گواہی جس کے بارے میں دعویٰ ہے، پھر توبہ کی دعوت، پھر عقلی دلیل، پھر عملی نتیجہ، اور آخر میں مرض کی تشخیص۔ یہ ایک مکمل علمی مقدمہ ہے جس میں جذبات کے بجائے دلیل، اور تحقیر کے بجائے دعوت کو بنیاد بنایا گیا ہے۔

آیت کے اجزا کا تحلیلی مطالعہ

اسلوب حصر: "مَا الْمَسِيحُ ابْنُ مَرْيَمَ إِلَّا رَسُولٌ"

آیت کا آغاز "ما... إلا" کے اسلوب حصر سے ہوتا ہے۔ علم بلاغت کی اصطلاح میں یہ "قصر موصوف علی الصفت" ہے یعنی موصوف (حضرت مسیحؑ) کو ایک صفت (رسالت) میں محصور کر دیا گیا اور چونکہ مخاطب کا عقیدہ اس کے برعکس تھا (یعنی وہ مسیحؑ کو رسول سے بڑھ کر الٰہ مانتے تھے) اس لیے یہ "قصر قلب" ہے، جس کا مقصد مخاطب کے عقیدے کو الٹ دینا ہے[71]۔ یہ حصر مطلق نہیں بلکہ اضافی ہے یعنی اس کا مطلب یہ نہیں کہ مسیحؑ میں رسالت کے سوا کوئی صفت نہیں تھی بلکہ یہ کہ زیر بحث مسئلے (الوہیت) کے لحاظ سے ان کا مقام رسالت سے آگے نہیں جاتا۔

"قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ": تاریخی تسلسل کا استدلال

یہ جملہ دو گہرے معانی رکھتا ہے۔ پہلا یہ کہ حضرت مسیحؑ رسولوں کے ایک طویل سلسلے کی ایک کڑی ہیں، ان سے پہلے بھی رسول آئے جنہوں نے معجزات دکھائے اور کسی نے ان کو خدا نہیں مانا۔ امام زمخشریؒ نے اس کی تفسیر میں یہی نکتہ بیان کیا کہ اگر مسیحؑ نے

مردے کو زندہ کیا تو حضرت موسیٰؑ نے لاٹھی کو سانپ بنایا اور اگر حضرت مسیحؑ بغیر باپ کے پیدا ہوئے تو حضرت آدمؑ بغیر ماں باپ کے پیدا ہوئے[72]۔ گویا یہ جملہ مسیحی دلائل میں سے پہلے دو، یعنی کنواری ولادت اور معجزات کا پیشگی جواب ہے۔

دوسرا معنی یہ ہے کہ "خلت" کا لفظ گزر جانے اور وفات پا جانے کے مفہوم پر بھی دلالت کرتا ہے، یعنی جس طرح پہلے رسول اس دنیا سے رخصت ہوئے، سیدنا مسیحؑ بھی اسی فانی صف میں ہیں۔ اس جملے کی معنویت اس وقت اور بھی واضح ہو جاتی ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے بالکل یہی الفاظ نبی کریم ﷺ کے بارے میں استعمال کیے ہیں: ﴿وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ قَدْ خَلَتْ مِن قَبْلِهِ الرُّسُلُ﴾[73]۔ یہ لفظی مماثلت ایک عظیم اصولی اعلان ہے۔ قرآن کا پیمانہ سب کے لیے ایک ہے۔ جو معیار اپنے نبی ﷺ کے لیے رکھا، وہی سیدنا مسیحؑ کے لیے بھی۔ یہ کسی ایک نبی کی تنقیص نہیں بلکہ تمام انبیاء کرام کو ان کے حقیقی مقام پر رکھنا ہے اور غلو کا وہ دروازہ بند کرنا ہے جس سے خود مسلمان بھی محفوظ نہیں۔

"وَأُمُّهُ صِدِّيقَةٌ": تردید کے بیچ تکریم

اس جملے میں قرآن کا اخلاقی اسلوب اپنے کمال پر نظر آتا ہے۔ عین اس وقت جب الوہیت کا رد کیا جا رہا ہے، حضرت مریمؑ کو "صدیقہ" کہہ کر ان کی عظمت کا اعلان کیا جاتا ہے۔ "صدیقہ" صیغۂ مبالغہ ہے، یعنی وہ جو سچائی اور تصدیق میں کمال کو پہنچی ہوئی ہو۔ اور قرآن میں صدیقین کا مقام انبیاء کرام کے بعد سب سے بلند ہے[74]۔ یہ لفظ دو محاذوں پر جواب ہے۔ ایک طرف ان یہود کو جو بی بی مریم پر بہتان باندھتے تھے اور دوسری طرف ان مسیحیوں کو جو انہیں الوہیت کے درجے تک لے جاتے تھے۔ صدیقہ ہونا بہت بلند مقام ہے مگر یہ بندگی کا مقام ہے، الوہیت کا نہیں۔

ایک اور نکتہ یہ ہے کہ قرآن نے بی بی مریم کے لیے "نبیہ" کے بجائے "صدیقہ" کا لفظ اختیار کیا۔ امام ابن کثیرؒ نے اس سے یہ استدلال کیا ہے کہ یہ آیت جمہور کے اس موقف کی تائید کرتی ہے کہ عورتوں میں نبوت نہیں ہوئی کیونکہ اگر مریم کا مقام اس سے بلند ہوتا تو مدح کے اس مقام پر اسی کا ذکر کیا جاتا[75]۔

"كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ": استدلال کا مرکز

یہ جملہ آیت کا مرکزی نقطہ ہے۔ یہاں تین باتیں خاص طور پر قابل غور ہیں۔

اولاً: فعل ماضی استمراری "کانا یاکلان" کا استعمال، جو بتاتا ہے کہ کھانا ان کی ایک مستقل اور عادی حالت تھی، کوئی اتفاقی واقعہ نہیں۔ **ثانیاً:** تثنیہ کا صیغہ، جو مسیحؑ اور بی بی مریم کو ایک ہی حکم میں جمع کرتا ہے۔

ثالثاً: "الطعام" کا لفظ، جو ہر قسم کی غذا کو شامل ہے اور انسانی حیات کی سب سے بنیادی احتیاج کی طرف اشارہ کرتا ہے۔

تثنیہ کے صیغے میں ایک لطیف استدلال پوشیدہ ہے۔ مسیحی روایت کا کوئی بڑا فرقہ بی بی مریم کو باقاعدہ الٰہ نہیں مانتا، اگرچہ ان کی تعظیم بہت بڑھا دی گئی (اور قرآن نے بھی ﴿أَأَنتَ قُلْتَ لِلنَّاسِ اتَّخِذُونِي وَأُمِّيَ إِلَٰهَيْنِ﴾[76] کے ذریعے اسی غلو کی طرف اشارہ کیا)۔ جب قرآن حضرت مسیحؑ اور بی بی مریم کو "کھانا کھانے" کی صفت میں جمع کرتا ہے تو وہ گویا یہ کہتا ہے کہ وجودی لحاظ سے یہ دونوں ایک ہی زمرے میں ہیں۔ جس صفت کی وجہ سے تم بی بی مریم کو الٰہ نہیں مانتے، وہی صفت حضرت مسیحؑ میں بھی موجود ہے۔ اگر وہ صفت بی بی مریم میں الوہیت کی نفی کرتی ہے، تو حضرت مسیحؑ میں کیوں نہیں کرتی؟ یہ "قیاس المساوات" کی ایک بلیغ صورت ہے۔

"انظُرْ كَيْفَ نُبَيِّنُ لَهُمُ الْآيَاتِ ثُمَّ انظُرْ أَنَّىٰ يُؤْفَكُونَ": **دو نظریں**

آیت کا اختتام دو "انظر" پر ہوتا ہے، جن کے درمیان "ثُمَّ" کا حرف ہے۔ مفسرین نے یہاں "ثُمَّ" کو زمانی تاخیر کے بجائے "تراخی رتبی" کے لیے قرار دیا ہے، یعنی پہلی بات (دلائل کا واضح ہونا) تعجب انگیز ہے اور دوسری بات (اتنے واضح دلائل کے باوجود گمراہ ہونا) اس سے کہیں زیادہ تعجب انگیز ہے[77]۔ "يؤفكون" کا مادہ "أفك" ہے، جس کے بنیادی معنی کسی چیز کو اس کے رخ سے پھیر دینے اور الٹ دینے کے ہیں[78]۔ یہ ایک گہرا نفسیاتی اور معرفتی اشارہ ہے۔ گمراہی کا سبب دلیل کی کمی نہیں بلکہ ذہن کا الٹ جانا ہے۔ وہ ذہن جو واضح کو مبہم اور مبہم کو واضح سمجھنے لگے۔

قرآن میں "اکل طعام" بطور علامت بشریت

اس آیت کا مفہوم اس وقت اور بھی واضح ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ قرآن نے دوسرے مقامات پر بھی "کھانا کھانے" کو بشریت کی بنیادی علامت کے طور پر استعمال کیا ہے۔ مشرکین مکہ نے نبی کریم ﷺ پر اعتراض کیا: ﴿مَالِ هَٰذَا الرَّسُولِ يَأْكُلُ الطَّعَامَ وَيَمْشِي فِي الْأَسْوَاقِ﴾[79]۔ اور قرآن نے جواب دیا: ﴿وَمَا أَرْسَلْنَا قَبْلَكَ مِنَ الْمُرْسَلِينَ إِلَّا إِنَّهُمْ لَيَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَيَمْشُونَ فِي الْأَسْوَاقِ﴾[80]۔ یعنی کھانا کھانا تمام رسولوں کی مشترک صفت ہے اور یہ ان کی بشریت کی علامت ہے۔ اس سے بھی زیادہ معنی خیز آیت یہ ہے: ﴿وَمَا جَعَلْنَاهُمْ جَسَدًا لَّا يَأْكُلُونَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوا خَالِدِينَ﴾[81]۔ اس آیت میں "کھانا کھانے" اور "ہمیشہ نہ رہنے" کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا ہے، گویا یہ بتایا گیا کہ کھانے کی احتیاج اور فانی ہونا ایک ہی حقیقت کے دو پہلو ہیں۔

اس سلسلے کی سب سے لطیف آیت حضرت ابراہیمؑ کے مہمانوں والی ہے۔ جب فرشتے انسانی شکل میں ان کے پاس آئے اور آپؑ نے ان کے سامنے بھنا ہوا بچھڑا پیش کیا تو قرآن کہتا ہے: ﴿فَلَمَّا رَأَىٰ أَيْدِيَهُمْ لَا تَصِلُ إِلَيْهِ نَكِرَهُمْ﴾[82]۔ یعنی فرشتوں نے کھانا نہیں کھایا۔ یہ واقعہ ایک گہرا وجودی نکتہ واضح کرتا ہے۔ کھانے کی احتیاج تو فرشتوں کے مقام سے بھی فروتر ہے۔ اگر فرشتے، جو مخلوق ہیں، کھانے سے بے نیاز ہیں تو جو ہستی کھانے کی محتاج ہو وہ خالق کیسے ہو سکتی ہے؟ یہ ایک "قیاس اولیٰ" ہے جو آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کے استدلال کو مزید تقویت دیتا ہے۔

آیت کا فلسفیانہ تجزیہ اور مسیحی مقدمات کا جواب

استدلال کی منطقی تشکیل

آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ کے استدلال کو اگر منطق کی زبان میں ترتیب دیا جائے تو یہ "قیاس اقترانی" کی پہلی شکل میں ایک مکمل برہان بنتا ہے، جسے منطقی اعتبار سے سب سے واضح اور بدیہی الانتاج شکل سمجھا جاتا ہے[83]۔

مقدمۂ صغریٰ: حضرت مسیحؑ کھانا کھاتے تھے (یہ بات مشاہدے سے ثابت ہے، اور اناجیل اس کی گواہ ہیں)۔

مقدمۂ کبریٰ: جو کھانا کھائے وہ محتاج ہے (یہ بات بداہت عقل سے ثابت ہے)۔

نتیجۂ اول: سیدنا مسیحؑ محتاج تھے۔

پھر اس نتیجے کو ایک دوسرے قیاس کا صغریٰ بنایا جاتا ہے:

مقدمۂ صغریٰ: حضرت مسیحؑ محتاج تھے۔

مقدمۂ کبریٰ: جو محتاج ہو وہ الٰہ نہیں۔

نتیجۂ آخر: سیدنا مسیحؑ الٰہ نہیں۔

اس برہان کی قوت اس میں ہے کہ اس کا ہر مقدمہ فریق مخالف کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔ مسیحی نہ اس بات کا انکار کرتے ہیں کہ حضرت مسیحؑ کھانا کھاتے تھے (بلکہ ان کی اپنی اناجیل اس کی گواہ ہیں)، نہ اس بات کا کہ کھانا احتیاج کی دلیل ہے اور نہ اس بات کا کہ خدا ہر احتیاج سے پاک ہے۔ جب تینوں مقدمات مسلّم ہوں تو نتیجے کا انکار منطقی طور پر ممکن نہیں، الّا یہ کہ کسی مقدمے میں کوئی تاویل کی جائے۔

"اکل طعام" کے پانچ لوازم

کھانا کھانا ایک سادہ عمل نظر آتا ہے، لیکن فلسفیانہ تجزیہ بتاتا ہے کہ یہ اپنے اندر کم از کم پانچ ایسے لوازم رکھتا ہے جن میں سے ہر ایک الوہیت کے منافی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن نے تمام بشری صفات میں سے اس ایک صفت کا انتخاب کیا، یہ ایک صفت پوری بشریت کا نچوڑ ہے۔

پہلا لازمہ احتیاج ہے۔ کھانے والا اپنی بقا کے لیے اپنے سے باہر کی کسی چیز کا محتاج ہے۔ اس کا وجود اپنے آپ میں مکمل نہیں بلکہ ہر چند گھنٹوں کے بعد باہر سے تکمیل کا طالب ہے۔ یہ احتیاج غنائے مطلق کی صریح نفی ہے۔

دوسرا لازمہ جسمانیت اور ترکیب ہے۔ کھانا صرف وہی کھا سکتا ہے جس کا جسم ہو اور جسم کا مطلب ہے اجزاء سے مرکب ہونا: معدہ، آنتیں، خون اور خلیات۔ جو مرکب ہو وہ اپنے اجزا کا محتاج ہے، اور جو اپنے اجزا کا محتاج ہو وہ واجب الوجود نہیں۔ یہ آٹھویں شرط یعنی تنزیہ کی نفی ہے۔

تیسرا لازمہ تغیر ہے۔ کھانے کا پورا عمل تغیر کا ایک مسلسل سلسلہ ہے۔ بھوک سے سیری، سیری سے ہضم، ہضم سے پھر بھوک۔ کھانا جسم کا حصہ بنتا ہے، جسم بدلتا ہے، خلیات مرتے اور نئے بنتے ہیں۔ یہ وہی "اُفول" ہے جس کی بنیاد پر حضرت ابراہیمؑ نے ستاروں کو الوہیت سے خارج کیا تھا۔

چوتھا لازمہ فنا پذیری ہے۔ جو جسم کھانے کا محتاج ہو، وہ کھانا نہ ملنے پر مر سکتا ہے۔ یعنی کھانے کی احتیاج دراصل موت کے امکان کا دوسرا نام ہے۔ یہی وجہ ہے کہ سورۂ انبیاء کی آیت 8 "وَمَا جَعَلْنٰهُمْ جَسَدًا لَّا يَاْكُلُوْنَ الطَّعَامَ وَمَا كَانُوْا خٰلِدِيْنَ" میں "کھانا کھانے" اور "ہمیشہ نہ رہنے" کو ایک ساتھ ذکر کیا گیا۔ یہ دوسری شرط یعنی ازلیت و ابدیت کی نفی ہے۔

پانچواں لازمہ وہ ہے جس کی طرف مفسرین نے کنائے کے طور پر اشارہ کیا ہے یعنی فضلے کا اخراج۔ یہ وہ پہلو ہے جو الوہیت کے تصور کے ساتھ سب سے زیادہ متضاد ہے اور قرآن مجید نے اسے صراحت کے بجائے کنائے میں بیان کر کے ایک طرف ادب کا لحاظ رکھا اور دوسری طرف دلیل کی قوت میں کوئی کمی نہیں آنے دی۔

ان پانچ لوازم کا مجموعی نتیجہ یہ ہے کہ "کھانا کھانا" ایک ایسا جامع عنوان ہے جس کے نیچے بشری کمزوری کے تمام بنیادی پہلو جمع ہیں۔ اسی لیے یہ ایک صفت الوہیت کی تقریباً تمام شرائط کی بیک وقت نفی کرتی ہے۔

مسیحی جواب: "دو فطرتوں" کی تاویل

مسیحی الٰہیات اس قرآنی استدلال سے ناواقف نہیں رہی۔ قرون وسطیٰ میں مسلمانوں اور مسیحیوں کے درمیان ہونے والے مکالموں میں یہ دلیل بار بار پیش ہوئی اور مسیحی متکلمین نے اس کا ایک معیاری جواب وضع کیا جو خلقیدون کی تعریف پر قائم ہے۔ جواب یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ میں دو فطرتیں ہیں: الٰہی اور انسانی۔ کھانا، تھکنا، سونا اور مرنا انسانی فطرت کے افعال ہیں جبکہ ازلیت، علم کُل اور قدرت مطلقہ الٰہی فطرت کی صفات ہیں۔ لہٰذا یہ کہنا کہ "حضرت مسیحؑ کھانا کھاتے تھے" ان کی الوہیت کے منافی نہیں کیونکہ کھانے والی ان کی انسانی فطرت تھی، الٰہی نہیں۔

بظاہر یہ ایک ذہین جواب ہے۔ لیکن جب اسے دقت نظر سے دیکھا جائے تو معلوم ہوتا ہے کہ یہ جواب قرآنی استدلال کو رد نہیں کرتا بلکہ ایک ایسے فکری معضلے کو جنم دیتا ہے جس سے مسیحی الٰہیات آج تک نکل نہیں سکی۔ یہی اس آرٹیکل کا مرکزی فلسفیانہ نکتہ ہے۔

معضلۂ ذوالحدین: کھانے والا کون تھا؟

سوال یہ ہے کہ جب حضرت مسیحؑ کھانا کھاتے تھے تو کھانے والا "کون" تھا؟ یہاں "کیا" کا نہیں، "کون" کا سوال ہے یعنی فطرت کا نہیں، شخصیت (اقنوم) کا سوال ہے۔ کیونکہ کھانا ایک فعل ہے اور فعل فطرت کا نہیں، فاعل کا ہوتا ہے۔ فطرت وہ ہے جس کے ذریعے فعل ہوتا ہے مگر فعل کرنے والا ہمیشہ ایک "شخص" ہوتا ہے۔ اب اس سوال کے صرف دو ممکنہ جواب ہیں اور دونوں مسیحی الٰہیات کے لیے مہلک ہیں۔

پہلا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ کھانے والا خدا کا ازلی کلمہ یعنی دوسرا اقنوم تھا جس نے اپنی انسانی فطرت کے ذریعے کھایا۔ یہی وہ جواب ہے جو خلقیدون کی تعریف اور سیرل کی الٰہیات کا لازمی تقاضا ہے کیونکہ ان کے مطابق حضرت مسیحؑ میں صرف ایک اقنوم ہے اور وہ الٰہی اقنوم ہے، انسانی فطرت کا اپنا کوئی الگ اقنوم نہیں۔ اسی اصول کو مسیحی الٰہیات میں "تبادل صفات" (communication idiomatum) کہا جاتا ہے یعنی دونوں فطرتوں کی صفات ایک ہی شخص کی طرف منسوب کی جاتی ہیں اور یوں یہ کہنا درست ہے کہ "خدا پیدا ہوا"، "خدا نے دکھ اٹھایا"، اور "خدا مرا"[84]۔ اگر یہی جواب درست ہے تو نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ ایک الٰہی اقنوم یعنی خود خدا، کھانے کا محتاج ہوا۔ اور یہ غنائے مطلق کی صریح نفی ہے جسے مسیحی الٰہیات خود خدا کی بنیادی صفت مانتی ہے۔ زبور کا وہ بیان کہ خدا بھوکا نہیں ہوتا اور ملاکی کا بیان کہ خدا بدلتا نہیں، دونوں اس جواب سے ٹکرا جاتے ہیں۔

دوسرا جواب یہ ہو سکتا ہے کہ کھانے والا الٰہی اقنوم نہیں تھا بلکہ انسانی مسیح تھا، جو ایک الگ فاعل کی حیثیت سے کھاتا پیتا تھا اور الٰہی کلمہ اس فعل میں شریک نہیں تھا۔ اس جواب سے غنائے الٰہی تو محفوظ رہتا ہے مگر اس کی قیمت یہ ہے کہ حضرت مسیحؑ میں دو فاعل یعنی دو شخصیتیں، ماننی پڑتی ہیں۔ ایک الٰہی جو نہیں کھاتا اور ایک انسانی جو کھاتا ہے۔ اور یہ بعینہٖ وہی نسطوری موقف ہے جسے 431ء میں افسس کی کونسل نے بدعت قرار دے کر رد کر دیا تھا۔ مزید یہ کہ اگر کھانے والا انسانی مسیح ایک الگ شخص تھا تو وہی شخص تھا جو لوگوں کے سامنے موجود تھا، جس سے لوگ ملتے تھے جو بولتا اور چلتا تھا اور اس شخص کے بارے میں مسیحی بھی مانتے ہیں کہ وہ الٰہ نہیں۔ تو پھر "مسیح خدا ہے" کا دعویٰ کس کے بارے میں ہے؟

یوں مسیحی الٰہیات ایک ایسے معضلے میں گرفتار ہے جس کے دونوں سرے اس کے اپنے عقیدے کو منہدم کرتے ہیں۔ اگر کھانے والا خدا تھا تو خدا محتاج ٹھہرا اور اگر کھانے والا خدا نہیں تھا تو حضرت مسیحؑ میں دو شخصیتیں ماننی پڑیں جو کلیسا کے نزدیک خود بدعت

ہے۔ تیسرا کوئی راستہ نہیں۔ یہاں قرآن مجید کے اس سادہ جملے کی گہرائی پوری طرح سامنے آتی ہے: ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ محض ایک مشاہدہ نہیں بلکہ ایک ایسا سوال ہے جو "دو فطرتوں" کے نظریئے کی بنیاد کو چیلنج کرتا ہے۔ چودہ صدیاں پہلے قرآن نے "کھانا کھانے" کو موضوع بنا کر دراصل یہ سوال اٹھایا کہ فعل کا فاعل کون ہے؟ اور یہ وہ سوال ہے جس کا کوئی تسلی بخش جواب خلقیدون کی تعریف کے اندر رہتے ہوئے نہیں دیا جاسکتا۔

مسیحی مقدمات کا تفصیلی جواب

اب اوپر مذکور چھ مسیحی مقدمات کا ایک ایک کر کے جائزہ لیتے ہیں۔

کنواری ولادت کا جواب

کنواری ولادت ایک معجزہ ہے، اور معجزہ خالق کی قدرت کی دلیل ہوتا ہے، مخلوق کی الوہیت کی نہیں۔ اگر بغیر باپ کے پیدا ہونا الوہیت کی دلیل ہوتا تو حضرت آدمؑ جو بغیر ماں اور باپ دونوں کے پیدا ہوئے، اس کے زیادہ مستحق ہوتے۔ قرآن مجید نے یہی جواب دیا: ﴿إِنَّ مَثَلَ عِيسَىٰ عِندَ اللَّهِ كَمَثَلِ آدَمَ﴾۔ اور خود بائبل کے مطابق ملک صدق (Melchizedek) کے بارے میں کہا گیا کہ اس کا نہ باپ تھا نہ ماں، نہ نسب نامہ[85]، مگر کسی مسیحی نے اسے خدا نہیں مانا۔ مزید یہ کہ ولادت خواہ وہ کتنی ہی معجزانہ ہو، ایک ابتدا ہے اور جس کی ابتدا ہو وہ ازلی نہیں۔ کنواری ولادت الوہیت کی دلیل بننے کے بجائے حدوث کی دلیل ہے۔

معجزات کا جواب

معجزات کے بارے میں قرآن کا جواب "بإذن الله" کی تکرار ہے۔ معجزہ نبی کا فعل نہیں، اللہ کا فعل ہے جو نبی کے ہاتھ پر ظاہر ہوتا ہے۔ اسی لیے دوسرے انبیاء کرام کے ہاتھ پر بھی ایسے معجزات ظاہر ہوئے۔ بائبل کے مطابق ایلیاہ (Elijah) نبی نے ایک بیوہ کے بیٹے کو زندہ کیا[86] اور الیشع (Elisha) نبی کی ہڈیوں کو چھونے سے ایک مردہ زندہ ہو گیا[87]۔ اگر مردے کو زندہ کرنا الوہیت کی دلیل ہوتا تو یہ انبیاء کرام بھی الٰہ ہوتے۔ خود انجیل یوحنا میں لعزر کو زندہ کرنے سے پہلے حضرت مسیحؑ کی دعا منقول ہے، جس میں وہ باپ کا شکر ادا کرتے ہیں کہ اس نے ان کی سنی[88]۔ جو معجزہ دعا کے بعد ظاہر ہو وہ دعا قبول کرنے والے کا فعل ہے، دعا کرنے والے کا نہیں۔

"ابن الله" اور "کلمه" کا جواب

بائبل میں "خدا کا بیٹا" کا لقب صرف حضرت مسیحؑ کے لیے نہیں آیا۔ سیدنا آدمؑ کو خدا کا بیٹا کہا گیا[89]، بنی اسرائیل کو خدا کا پہلوٹھا بیٹا کہا گیا[90]، اور صلح کرانے والوں کو خدا کے بیٹے کہا گیا[91]۔ عبرانی محاورے میں یہ لقب خدا کے قرب اور محبوبیت کی علامت ہے، جوہری شراکت کی نہیں۔ سب سے دلچسپ بات یہ ہے کہ جب یہودیوں نے سیدنا مسیحؑ پر خدا ہونے کا دعویٰ کرنے کا الزام لگایا تو انہوں نے اپنے دفاع میں زبور کی وہ آیت پیش کی جس میں عام انسانوں (قاضیوں) کو "الٰہ" کہا گیا ہے[92]۔ گویا خود حضرت مسیحؑ نے اس لقب کی وہی تعبیر کی جو استعاراتی ہے۔

"کلمہ" کے بارے میں قرآن کا موقف واضح ہے: ﴿إِنَّمَا الْمَسِيحُ عِيسَى ابْنُ مَرْيَمَ رَسُولُ اللَّهِ وَكَلِمَتُهُ أَلْقَاهَا إِلَىٰ مَرْيَمَ وَرُوحٌ مِّنْهُ﴾[93]۔ مفسرین نے وضاحت کی کہ حضرت مسیحؑ کو "کلمۃ اللہ" اس لیے کہا گیا کہ وہ اللہ کے کلمۂ "کُن" سے، عام اسباب

کے بغیر پیدا ہوئے[94]۔ یعنی وہ کلمے کا نتیجہ ہیں، خود ازلی کلمہ نہیں۔ اور اسی آیت کے آخر میں قرآن نے صاف کہہ دیا: ﴿وَلَا تَقُولُوا ثَلَاثَةٌ ۚ انتَهُوا خَيْرًا لَّكُمْ ۚ إِنَّمَا اللَّهُ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ ۖ سُبْحَانَهُ أَن يَكُونَ لَهُ وَلَدٌ﴾۔

باپ کے ساتھ وحدت کے دعووں کا جواب

"میں اور باپ ایک ہیں" کا جملہ اپنے سیاق میں ارادے اور مقصد کی وحدت پر دلالت کرتا ہے، ذات کی وحدت پر نہیں۔ اس کی دلیل یہ ہے کہ انجیل یوحنا ہی میں حضرت مسیحؑ اپنے شاگردوں کے لیے دعا کرتے ہیں کہ وہ بھی اسی طرح ایک ہوں جس طرح ہم ایک ہیں[95]۔ ظاہر ہے کہ شاگردوں کی "وحدت" ذات کی وحدت نہیں تھی۔ اس کے مقابلے میں اسی انجیل میں ایسے صریح اقوال موجود ہیں جو حضرت مسیحؑ اور خدا کے درمیان فرق کو واضح کرتے ہیں۔ "باپ مجھ سے بڑا ہے"[96]، "ہمیشہ کی زندگی یہ ہے کہ وہ تجھ خدائے واحد اور برحق کو اور یسوع مسیح کو جسے تو نے بھیجا ہے جانیں"[97] اور قیامت کے بعد کا یہ قول کہ میں اپنے باپ اور تمہارے باپ، اور اپنے خدا اور تمہارے خدا کے پاس اوپر جاتا ہوں[98]۔ آخری جملہ قرآن کی اس آیت سے حیرت انگیز مماثلت رکھتا ہے جس میں سیدنا مسیحؑ کا قول نقل ہوا۔ ﴿اعْبُدُوا اللَّهَ رَبِّي وَرَبَّكُمْ﴾۔ جو کسی کو "اپنا خدا" کہے، وہ خود خدا نہیں ہو سکتا۔ اسی طرح جب ایک شخص نے سیدنا مسیحؑ کو "نیک استاد" کہا تو انہوں نے فرمایا کہ تو مجھے نیک کیوں کہتا ہے؟ کوئی نیک نہیں مگر ایک، یعنی خدا[99]۔ اور جب ان سے سب سے بڑے حکم کے بارے میں پوچھا گیا تو انہوں نے توحید کا وہی اعلان دہرایا جو تورات میں ہے۔ "اے اسرائیل سن، خداوند ہمارا خدا ایک ہی خداوند ہے"[100]۔

کفارے کی ضرورت کا جواب

انسلم کا استدلال ایک ایسے مقدمے پر قائم ہے جسے قرآن بنیادی طور پر رد کرتا ہے: یہ کہ گناہ وراثت میں منتقل ہوتا ہے اور ایک کے گناہ کا بوجھ دوسرا اٹھا سکتا ہے۔ قرآن کا اصول ہے۔ ﴿وَلَا تَزِرُ وَازِرَةٌ وِزْرَ أُخْرَىٰ﴾[101]۔ اور یہی اصول بائبل کے عہد نامۂ قدیم میں بھی صراحت سے موجود ہے کہ بیٹا باپ کے گناہ کا بوجھ نہیں اٹھائے گا اور نہ باپ بیٹے کے گناہ کا[102]۔ پھر قرآن کے مطابق حضرت آدمؑ نے توبہ کی اور اللہ نے ان کی توبہ قبول کر لی[103]، تو جو گناہ معاف ہو چکا اس کی سزا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ مزید یہ کہ اگر خدا قادر مطلق اور رحیم ہے تو وہ توبہ پر معاف کرنے کی قدرت رکھتا ہے اور اسے معافی کے لیے کسی قربانی کی "ضرورت" نہیں۔ "ضرورت" کا لفظ خود خدا کی ذات میں ایک احتیاج ثابت کرتا ہے، جو پھر غنائے مطلق کی نفی ہے۔ یوں انسلم کا استدلال بھی بالآخر اسی بنیادی سوال پر آ کر رک جاتا ہے جو آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ نے اٹھایا تھا۔

قرآنی اسلوب کی امتیازی خصوصیات

اس پورے تجزیئے سے قرآن کے اسلوب استدلال کی چند امتیازی خصوصیات سامنے آتی ہیں۔

1) سادگی میں گہرائی ہے۔ قرآن مجید نے ایک ایسی دلیل اختیار کی جو ایک دیہاتی کی سمجھ میں بھی آتی ہے اور ایک فلسفی کو بھی لاجواب کر دیتی ہے۔ یہ دلیل نہ کسی خاص فلسفیانہ مکتب کی محتاج ہے، نہ کسی خاص زمانے کے علوم کی۔

2) فریق مخالف کے مسلّمات سے استدلال ہے۔ قرآن نے ایسی کوئی بات بنیاد نہیں بنائی جسے مسیحی تسلیم نہ کرتے ہوں۔ سیدنا مسیحؑ کا کھانا کھانا ان کی اپنی اناجیل میں مذکور ہے اور خدا کا غنی ہونا ان کی اپنی الٰہیات کا بنیادی اصول ہے۔

3) ادب اور تکریم ہے۔ تردید کے عین درمیان "و امه صديقة" کہہ کر قرآن نے یہ سکھایا کہ عقیدے میں اختلاف شخصیات کی تحقیر کا جواز نہیں بنتا اور فضلے کے اخراج جیسی بات کو کنائے میں بیان کر کے یہ دکھایا کہ مضبوط ترین دلیل بھی شائستہ ترین الفاظ میں دی جاسکتی ہے۔

4) آخری خصوصیت دعوت کا رخ ہے۔ اس مکالمے کا مقصد مخالف کو شکست دینا نہیں بلکہ اسے واپس بلانا ہے، جیسا کہ آیت 74 کی دعوت توبہ اور آیت 77 کی "لا تغلوا" کی نصیحت سے ظاہر ہے۔ قرآن کا مخاطب دشمن نہیں بلکہ ایک بھٹکا ہوا بھائی ہے جسے حقیقت کی طرف لوٹانا مقصود ہے۔

نتائج تحقیق

اس مطالعے سے درج ذیل نتائج سامنے آتے ہیں:

1. قرآن و عقل کی روشنی میں الوہیت کی کم از کم بارہ لازمی شرائط ثابت ہوتی ہیں۔ وجوب وجود، ازلیت و ابدیت، غنائے مطلق، قدرت مطلقہ، علم محیط، حیات ذاتی و قیومیت، وحدانیت، جسمانیت و تغیر سے تنزیہ، خالقیت، نفع و ضرر کی مالکیت، والد و ولد سے پاکی، اور دعا کا سننا اور قبول کرنا۔ یہ تمام شرائط دراصل ایک ہی بنیادی صفت، یعنی غنائے مطلق کی مختلف جہتیں ہیں۔
2. آیت ﴿كَانَا يَأْكُلَانِ الطَّعَامَ﴾ ایک مکمل منطقی برہان ہے جو قیاس اقترانی کی پہلی شکل پر قائم ہے اور جس کا ہر مقدمہ فریق مخالف کے نزدیک بھی مسلّم ہے۔
3. "کھانا کھانا" پانچ لوازم رکھتا ہے یعنی احتیاج، ترکیب، تغیر، فنا پذیری، اور فضلے کا اخراج، جن میں سے ہر ایک الوہیت کی کسی نہ کسی شرط کی نفی کرتا ہے۔ اسی لیے یہ ایک صفت پوری بشریت کا جامع عنوان ہے۔
4. مسیحی الٰہیات کا "دو فطرتوں" والا جواب ایک ناقابل حل معضلے میں گرفتار ہے۔ اگر کھانے والا الٰہی اقنوم تھا تو خدا محتاج ٹھہرا، اور اگر انسانی مسیح ایک الگ فاعل تھا تو یہ وہی نسطوریت ہے جسے خود کلیسا نے رد کیا۔ جدید تاویلات، یعنی تخلیہ اور دو اذہان، بھی اس معضلے سے نکلنے میں کامیاب نہیں ہوئیں۔
5. بائبل کی داخلی شہادتیں، خصوصاً زبور 50:12 (خدا بھوکا نہیں ہوتا)، ملاکی 03:06 (خدا بدلتا نہیں) اور لوقا 24:43 (قیامت کے بعد مسیحؑ کا کھانا کھانا)، قرآنی استدلال کی تائید کرتی ہیں اور اسے مسیحی روایت کے لیے ایک داخلی چیلنج بنا دیتی ہیں۔
6. الوہیت مسیحؑ کے حق میں پیش کیے جانے والے چھ بنیادی مقدمات میں سے کوئی بھی الوہیت کو ثابت نہیں کرتا۔ کنواری ولادت، معجزات، القاب، وحدت کے اقوال، کفارہ اور اختیارات، سب کی تعبیر بائبل کے اپنے سیاق اور قرآن کی روشنی میں نبوت اور بندگی کے دائرے میں ہوتی ہے۔

7. قرآن کا اسلوب استدلال سادگی میں گہرائی، مخالف کے مسلّمات سے استدلال، ادب و تکریم، اور دعوتی رخ کا ایک ایسا امتزاج ہے جو آج کے بین المذاہب مکالمے کے لیے ایک کامل نمونہ فراہم کرتا ہے۔

Refrences:

[1] Surah al-Ma'idah 5:75

[2] Surah al-Ma'idah 5:17

[3] Ibn Faris, Abul Husain Ahmad, Mu'jam Maqayis al-Lughah, tahqiq: Abdus Salam Harun (Beirut: Dar al-Fikr, 1399H/1979), madda "a-l-h"1: 127

[4] Ibn Manzur, Muhammad bin Mukarram, Lisan al-Arab (Beirut: Dar Sadir, 1414H), madda "a-l-h", 13:467

[5] Al-Raghib al-Isfahani, Abul Qasim al-Husain bin Muhammad, al-Mufradat fi Gharib al-Qur'an, tahqiq: Safwan Adnan al-Dawudi (Damascus: Dar al-Qalam, 1412H), madda "ilah", 1:59

[6] Surah al-An'am 6:74

[7] Surah al-Baqarah 2:163

[8] Al-Taftazani, Sa'd ud Din Mas'ud bin Umar, Sharh al-Aqa'id al-Nasafiyyah (Karachi: Maktabat al-Madinah, s.n.), bahs "al-muhdith lil-alam huwa Allah",p:139

[9] Ibn Sina, Abu Ali al-Husain bin Abdullah, al-Isharat wa al-Tanbihat, ma'a Sharh Nasir ud Din al-Tusi (Cairo: Dar al-Ma'arif, 1960), al-namat al-rabi', 3: 272

[10] Aquinas, Thomas, Summa Theologica, Part I, Question 3, Article 1; aur Question 9, Article 1 (khuda ki la-taghayyur zaat par bahs). Angrezi tarjuma: Fathers of the English Dominican Province (New York: Benziger Bros., 1947)

[11] Surah al-Hadid 57:3

[12] Surah al-Rahman 55:26-27

[13] Surah al-Furqan 25:58

[14] Surah al-Ma'idah 5:17

[15] Surah Fatir 35:15

[16] Surah al-Ikhlas 112:2

[17] Al-Tabari, Abu Ja'far Muhammad bin Jarir, Jami' al-Bayan an Ta'wil Ay al-Qur'an, tahqiq: Abdullah bin Abdul Muhsin al-Turki (Cairo: Dar Hajr, 1422H/2001), al-Ikhlas 112:2. (Imam Tabari ne "al-Samad" ke ma'na mein "الذی لا جوف لہ" ka qaul mut'addid aslaf se naql kiya hai.)

[18] Surah al-An'am 6:14

[19] Surah al-Dhariyat 51:57

[20] Bible (King James Version), Zaboor (Psalms) 50:12-13: "If I were hungry, I would not tell thee: for the world is mine, and the fulness thereof. Will I eat the flesh of bulls, or drink the blood of goats?"

[21] Surah al-Baqarah 2:20

[22] Surah Al Imran 3:49; aur Surah al-Ma'idah 5:110. (Dono maqamat par har mo'jize ke sath "bi-idhni Allah" ya "bi-idhni" ki qaid ka takrar qabil-e-ghaur hai)

[23] Injeel-e-Yuhanna (John) 5:30: "I can of mine own self do nothing."

[24] Surah Saba 34:3

[25] Surah al-Mulk 67:14

[26] Surah al-Ma'idah 5:116

[27] Injeel-e-Marqus (Mark) 13:32: "But of that day and that hour knoweth no man, no, not the angels which are in heaven, neither the Son, but the Father."

[28] Surah al-Baqarah 2:255

[29] Zaboor (Psalms) 121:4: "Behold, he that keepeth Israel shall neither slumber nor sleep."

[30] Yasa'yah (Isaiah) 40:28: "the everlasting God, the LORD, the Creator of the ends of the earth, fainteth not, neither is weary."

[31] Injeel-e-Yuhanna (John) 4:6: "Jesus therefore, being wearied with his journey, sat thus on the well."

[32] Injeel-e-Marqus (Mark) 4:38

[33] Surah al-Anbiya 21:22

[34] Surah al-Mu'minun 23:91

[35] Surah al-Ma'idah 5:73

[36] Surah al-Shura 42:11

[37] Surah al-An'am 6:76

[38] Al-Razi, Fakhr ud Din Muhammad bin Umar, Mafatih al-Ghayb (al-Tafsir al-Kabir) (Beirut: Dar Ihya al-Turath al-Arabi, 1420H), zer-e-ayat al-An'am 6:76. (Imam Razi ne "ufool" ko taghayyur aur intiqal ki dalil qarar de kar is se huduth par istidlal kiya hai)

[39] Malaki (Malachi) 3:6: "For I am the LORD, I change not."

[40] Gintee (Numbers) 23:19: "God is not a man, that he should lie"; aur Hosea 11:9: "for I am God, and not man."

[41] Surah al-Nahl 16:17

[42] Surah al-Nahl 16:20-21

[43] Surah Al Imran 3:59

[44] Surah al-Ma'idah 5:76

[45] Surah al-Ikhlas 112:3

[46] Surah al-An'am 6:101

[47] Kelly, J. N. D., Early Christian Doctrines, 5th ed. (London: Adam & Charles Black, 1977), 9:145 "The Nicene Crisis". Arius ke mauqif aur us ke khilaf Nicaea ke radd-e-amal ki tafseel ke liye.

[48] Surah al-Naml 27:62

[49] Surah al-Ahqaf 46:5

[50] Injeel-e-Matti (Matthew) 26:39. aur Injeel-e-Luqa (Luke) 22:41-44. (Hebrews 5:7 mein bhi Masih ki duaon aur girya-o-zari ka zikr hai.)

[51] Dunn, James D. G., Christology in the Making: A New Testament Inquiry into the Origins of the Doctrine of the Incarnation (London: SCM Press, 1980). (Dunn ne

Ahd Nama-e-Jadid ke mukhtalif tabaqat mein Masih ke tasawwur ke tadreeji irtiqa ka mutala'ah kiya hai.)

[52] Ehrman, Bart D., How Jesus Became God: The Exaltation of a Jewish Preacher from Galilee (New York: Harper One, 2014).

[53] Kelly, J. N. D., Early Christian Creeds, 3rd ed. (London: Longman, 1972), chapter 7: "The Creed of Nicaea".

[54] Cyril of Alexandria, "Third Letter to Nestorius", Anathema 12. Dekhiye: Tanner, Norman P. (ed.), Decrees of the Ecumenical Councils, vol. 1 (London: Sheed & Ward; Washington: Georgetown University Press, 1990), Council of Ephesus.

[55] Tanner, Norman P. (ed.), Decrees of the Ecumenical Councils, vol. 1, Council of Chalcedon (451), "Definition of the Faith". (Chalcedon ki ta'rif mein "do fitratein, ek uqnoom" ka usool bunyadi hai.)

[56] Injeel-e-Matti (Matthew) 1:18-25, Injeel-e-Luqa (Luke) 1:26-38

[57] Surah Maryam 19:16-22, Surah Al Imran 3:45-47

[58] Injeel-e-Yuhanna (John) 11:1-44

[59] Injeel-e-Yuhanna (John) 1:1 aur 1:14: "In the beginning was the Word, and the Word was with God, and the Word was God... And the Word was made flesh, and dwelt among us."

[60] Injeel-e-Yuhanna (John) 10:30: "I and my Father are one."

[61] Injeel-e-Yuhanna (John) 14:9

[62] Injeel-e-Yuhanna (John) 20:28: "My Lord and my God."

[63] Anselm of Canterbury, Cur Deus Homo (Why God became man? /Khuda Insan Kyun Bana?), Book II, chapters 6-7. P:66-67, [Angrezi tarjuma: Sidney Norton Deane, St. Anselm: Basic Writings (La Salle: Open Court, 1962)]

[64] Injeel-e-Marqus (Mark) 2:5-7

[65] Hick, John (ed.), The Myth of God Incarnate (London: SCM Press, 1977), P: 148

[66] Hick, John, The Metaphor of God Incarnate: Christology in a Pluralistic Age (London: SCM Press, 1993), (khusoosan ibtidai abwab. Hick ne tajseem ke aqeede ko lafzi ke bajaye isti'arati ma'ni mein samajhne par zor diya hai.)

[67] Morris, Thomas V., The Logic of God Incarnate (Ithaca: Cornell University Press, 1986).

[68] Surah al-Ma'idah 5:75

[69] Surah al-Ma'idah 5:72

[70] Surah al-Ma'idah 5:77

[71] Al-Qazwini, Jalal ud Din Muhammad bin Abdur Rahman, al-Idah fi Ulum al-Balaghah (Beirut: Dar al-Jil, s.n.), aqsam al-qasr fi bab al-qasr. 3:15 (Qasr-e-qalb ki ta'rif aur us ki misalon ke liye.)

[72] Al-Zamakhshari, Abul Qasim Mahmud bin Umar, al-Kashshaf an Haqa'iq Ghawamid al-Tanzil (Beirut: Dar al-Kitab al-Arabi, 1407H), zer-e-ayat al-Ma'idah 5:75. (Zamakhshari ne yahan sabiqa anbiya ke mo'jizat se muqabla kar ke istidlal kiya hai.)

[73] Surah Al Imran 3:144

[74] Surah al-Nisa 4:69

[75] Ibn Kathir, Abul Fida Isma'il bin Umar, Tafsir al-Qur'an al-Azim, tahqiq: Sami bin Muhammad Salamah (Riyadh: Dar Taybah, 1420H/1999), zer-e-ayat al-Ma'idah 5:75

[76] Surah al-Ma'idah 5:116

[77] Al-Alusi, Shihab ud Din Mahmud bin Abdullah, Ruh al-Ma'ani fi Tafsir al-Qur'an al-Azim wa al-Sab' al-Mathani (Beirut: Dar al-Kutub al-Ilmiyyah, 1415H), zer-e-ayat al-Ma'idah 5:75. Allama Alusi ne yahan "thumma" ko tafawut-e-martaba ke liye qarar diya hai.

[78] Al-Raghib al-Isfahani, al-Mufradat fi Gharib al-Qur'an, madda "afk".

[79] Surah al-Furqan 25:7

[80] Surah al-Furqan 25:20

[81] Surah al-Anbiya 21:8

[82] Surah Hud 11:70.

[83] Ibn Sina, al-Najat min al-Ghariq fi Bahr al-Dalalat, tahqiq: Muhammad Taqi Danish Pazhuh (Tehran: Intisharat-e-Daneshgah-e-Tehran, 1364 Shamsi), (qism al-mantiq, bahs al-qiyas al-iqtirani. Shakl-e-awwal ke "badihi al-intaj" hone ki bahs ke liye.)

[84] Aquinas, Thomas, Summa Theologica, Part III, Question 16, Articles 1-5. (Aquinas ne yahan Masih ke bare mein sifaat ke tabadul (communication idiomatum) ke usool aur us ki hudood par bahs ki hai.)

[85] Ibraniyon (Hebrews) 7:3: "Without father, without mother, without descent, having neither beginning of days, nor end of life."

[86] Salateen 1 (1 Kings) 17:21-22

[87] Salateen 2 (2 Kings) 13:21

[88] Injeel-e-Yuhanna (John) 11:41-42

[89] Injeel-e-Luqa (Luke) 3:38

[90] Khurooj (Exodus) 4:22

[91] Injeel-e-Matti (Matthew) 5:9

[92] Injeel-e-Yuhanna (John) 10:33-36, (jis mein Zaboor (Psalms) 82:6 ka hawala diya gaya hai: "I have said, Ye are gods.")

[93] Surah al-Nisa 4:171

[94] Al-Tabari, Jami' al-Bayan, 7:703, Ibn Kathir, Tafsir al-Qur'an al-Azim, 2:477, zer-e-ayat al-Nisa 4:171

[95] Injeel-e-Yuhanna (John) 17:21-22

[96] Injeel-e-Yuhanna (John) 14:28: "for my Father is greater than I."

[97] Injeel-e-Yuhanna (John) 17:3: "that they might know thee the only true God, and Jesus Christ, whom thou hast sent."

[98] Injeel-e-Yuhanna (John) 20:17: "I ascend unto my Father, and your Father; and to my God, and your God."

[99] Injeel-e-Marqus (Mark) 10:18: "Why callest thou me good? there is none good but one, that is, God."

[100] Injeel-e-Marqus (Mark) 12:29, jis mein Istisna (Deuteronomy) 6:4 ka iqtibas hai.

[101] Surah al-An'am 6:164

[102] Hizqi'el (Ezekiel) 18:20: "The son shall not bear the iniquity of the father, neither shall the father bear the iniquity of the son."

[103] Surah al-Baqarah 2:37